5/-

دہلی

ذکاءالملک خواجہ-

ڈاکٹر الیف ایم شجاع منعمی

ایم-اے (علیگ)، بی-ایس سی-آنرس، ایم-اے (پنجاب)
ایم-ایس سی، ایم-ایچ-ایس-ایس (امریکہ) پی-ایچ-ڈی،
ایم-آر-ایس-ایل (لنڈن)

ہندوستان کے دارالسلطنت

دہلی

کی مجمل سرگذشت

اس کتاب میں شہر دہلی کی ابتدائے تاریخ سے لیکر آج تک کی تاریخ درج ہے۔ دہلی ہندوستان کی ہمیشہ سے راجدھانی رہی ہے۔ اسلئے تمام ہندوستان کی تاریخ اس کتاب میں آگئی ہے دہلی کے آٹھ شہروں کا عہد بعہد تذکرہ ہے۔ صحیفہ ادبی رنگ لئے ہوئے اور دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ چونکہ اس کتاب میں تمام قدیم عمارات کا ذکر ہے اور نقشہ جات ساتھ شامل کر دئے گئے ہیں۔ اس لئے دہلی دیکھنے والوں کے لئے یہ گائڈ بک کا کام دے گی۔

مصنفہ

ذکاء الملک خواجہ ڈاکٹر فریدون زماں محمد شجاع منعمی

ایم اے (علیگ) فارسی- بی- ایس سی آنرس (فزکس کیمسٹری)- ایم- اے (پنجاب) عربی
ایم- ایس- سی- ایم- ایچ- ایس- ایس (امریکہ) پی- ایچ- ڈی- ایم- آر- ایس (لنڈن)
سابق سینیئر پروفیسر سائنس حبیبیہ کالج- سابق معمور محکمہ آب ہوا سرکار ہند شملہ- پروفیسر
ایس- ای کالج وکیوریٹر صادق ریڈنگ لائبریری- بہاولپور- مصنف ایران- فوٹوگرافی- اسلام کے
یورپ پر احسانات- راج کنور وغیرہ وغیرہ-

پبلشر ڈاکٹر الیف- ایم- شجاع- بہاولپور

اشاعت دوم- ایک ہزار ۔ ۱۹۳۵ء ۔ قیمت

باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر اتحاد پریس ٹبل روڈ لاہور میں چھپی

ڈاکٹر ایف ایم شجاع نے بہاول پور سے شایع کیا

میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ کتاب ۳۲ پونڈ کے ۲۰×۳۰ کاغذ پر چھپی ہے۔
دستخط منیجر اتحاد پریس ٹبل روڈ لاہور۔

امین الدین

تمہید

کبھی ہم سرکارِ ہند کے مرکزی دفاتر میں ملازم تھے۔ زمانہ تھا! یہ اوراق اس دور کی یادگار ہیں۔ اور یادگار ہمیشہ عزیز ہوتی ہے۔

پریس سے نکلنے کی منتظر تھی، آج نوبت آئی۔

صادق ایجرٹن کالج۔ بہاولپور

مورخہ ۱۴؍ دسمبر ۱۹۲۷ء

ف۔م۔ش

دہلی

تعارف طبع ثانی

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اب آپ کے سامنے ہے۔ کتاب کا نام بدل کر دارالسلطنت دہلی سے دہلی کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مختصر ہے اور بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں کتاب میں اضافے کر دیئے گئے ہیں باقی صورت وہی ہے جو پہلے تھی۔ تصاویر میں بھی کچھ تبدیلی اور اضافے کئے گئے ہیں۔ سکوں کا بلاک خاص طور پر بنوایا گیا ہے۔

بہاولپور مارچ ۱۹۳۹ء

خواجہ شجاع منعمی

دیباچہ
(طبع اوّل)

ماقصۂ سکندرو دارانہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہرو وفا مپرس!

اس تاجداری اور مملکت سے ہمیں کیا مطلب مگر ؎

عشق است کہ بربستہ زبانِ ادبِ ما

تاریخ ایک دلچسپ صحیفہ ہے جس کے ذریعہ ہم گذشتہ واقعات کو سامنے رکھ کر مستقبل کی تجویزات کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ زمانہ ماضی کا تجربہ نسل آدم کی رہنمائی کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر بنی نوع انسان ایک عریض و بسیط مجمع ہے۔ اور اس کی تاریخ بہت وسیع احاطہ پر حاوی ہے یہاں پر ہر طرح کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ بشر کی مرضی تاریخ کو منطق کے ارفع درجے پر پہنچنے سے مانع ہے :

ملازمت بڑی علت ہے ؎

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد (اقبال)

حکم کے ماتحت کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ بعض مخصوص حالتوں میں تو سفر آخرت اختیار کرنے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔ پیٹ بڑی بلا ہے۔ یہ نہیں تو کسی کا کون محتاج ہے۔ فقیر آج بے نیاز تمنا ہو جائے تو خود بادشاہ ہے۔ مگر یہ "اُن پورنا" کا مسئلہ سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ اس دوزخ کو پُر کرنے کے لئے سیم و زر کی ضرورت ہے۔ چمکتے ہوئے سونے کی خیرہ کُن جھلک، "مردِ دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے"۔

اے زر تو خدا نہٗ ولیکن بخدا ستّارِ عیوب و قاضی الحاجاتی

یہ بھی بجا ہے؟

آخر جب تک انسان جیتا ہے۔ حسب منشاء خلاف منشاء کوئی نہ کوئی شغل قیامِ زندگی کی غرض سے اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔

ہمارے لئے۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں! ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

قدرت نے بدگمانی رفع کرنے کی بھی کیا ترکیب نکالی ہے! جائے شکر ہے۔

از منصبِ عشق سرفرازم کردند ؛ وز منتِ خلق بے نیازم کردند

چوں شمع دریں بزم گدازم کردند ؛ از سوختگی محرمِ رازم کردند

(سرمد)

امسال سردی کے موسم میں سرکار ہند کے دفاتر کے ساتھ زمانے کا چکر ہمیں بھی شملے سے دہلی لے آیا۔ بلّی ماراں، گلی قاسم جان! احاطہ کالے صاحب

جائے اقامت ہوئی۔ یہ شہر شاہجہان آباد کا مرکزی حصّہ ہے۔ گویا شہر کا دل ہے۔

یہ چھوٹی سی کتاب دار السلطنت دہلی کی تاریخ پر ایک مجمل نظر ہے۔ غرض یہ ہے کہ مسلسل سرگذشت سے واقفیت ہو جائے۔ اسلئے تفصیلات کو معرض بحث میں نہیں لایا گیا۔ دلچسپی کی بنا پر جو اہم عمارات کسی زمانے میں تعمیر ہوئیں۔ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کہانی مکمل ہونے کی مدعی نہیں ہے۔ فروعات اور غیر ضروری امور کو تسلسل کی نذر کرنا اس صورت میں قرین مصلحت سمجھا گیا ہے ؎

ہمیشہ پاک رہو منعمی زوائد سے
تراشنے سے ہوا سنگ سے خدا پیدا

فرائض منصبی کی کشاکش سے وقت نکال کر ایک موسم سرما کی محنت ہدیۂ نذر ہے اور ما قلّ و دلّ۔ اختصار کے سبب ممکن ہے۔ بعض مقامات پر پہلی خواندگی پر قدرے دقت محسوس ہو۔ ذرا توجہ سے سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ اور مختلف زمانوں کی دہلی کا مقام اور اہمیت معلوم ہو جاتی ہے۔ ضروری دلچسپ واقعات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ کسی بڑی کتاب سے بالتفصیل پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ سرزمین دہلی کا نقشہ کتاب کے شروع میں دیا دیا گیا ہے۔ اگر دوران مطالعہ میں اس سے متواتر مشورہ کیا جائے تو مختلف شہروں اور آثار قدیمہ کا محلِ وقوع معلوم کرنے میں بہت

آسانی ہوگی۔

مطالعہ سے معلوم ہوا کہ غیر ممالک کے رہنما یا تفریحی کتب کے مصنفین نے جو صحیفے دہلی کی نسبت تحریر کئے ہیں، بلحاظ واقعات، تعمیرات اور دلائل کئی مقامات پر ناقابل اعتبار رہیں۔ یوں تو ہر سطر میں وقائع نگار کی جھلک ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ تحقیق سے کام نہیں لیتے۔ کچھ اجنبی ہونے کے سبب مشرقی تہذیب سے مانوس نہیں۔ اور مناسب مواد دستیاب نہیں ہو سکتا۔ مشرق کی تمام دیگر چیزوں کی طرح مغربی معارف کے بادہ نوش اپنی کوتاہ نظری اور فقدان واقفیت کے سبب اپنے دماغ سے ایجاد کر کے کچھ اس میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر حقیر واقع کے لئے سبب اور دلیل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور اگر دلیل نہ مل سکے تو خود بنالی جائے۔ اس طرح سبب اور اثر علت و معلول کی ایک لڑی تیار کر لی جاتی ہے۔ افرنگی چونکہ مشرقی طرز بود و باش، یہاں کی روایات اور اخلاص و اخلاق سے ناواقف ہیں۔ اس لئے بعض اوقات فحش غلطیاں کرتے ہیں۔ وہ اس مشرقی سوز کے اندوہ ربا خط سے ناآشنا ہیں ؎

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

مختلف تاریخوں میں تقریباً تمام واقعات کے سن وقوع کی نسبت ایک

آدھ سال کا اختلاف ہے - اس کا سبب یہ ہے - کہ اس وقت سن ہجری رائج تھا - اور جب مہینوں کو اِدھر اُدھر تحویل کیا جائے تو کچھ فرق رہ جاتا ہے - چونکہ ہمارے ماخذ وہی ہیں، اس لئے ایک سال آگے پیچھے کا فرق کوئی خاص معنی نہیں رکھتا -

مختلف عہدوں کی عمارتوں کی ساخت میں بتدریج تبدیلی واقع ہوئی - مگر اوّل زمانے سے اُن کی بناوٹ کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا - کہ ایک دور کے نقشے کا انحصار اس کے پہلے عہدوں کی عمارتوں پر کس قدر تھا -

دہلی کے آثار الصنادید میں سے تمام اہم مقامات کے فوٹو، قیام دہلی کے دوران میں، ان اوراق کی خاطر لئے گئے تھے - مصارف کو دیکھ کر یہی قرین مصلحت سمجھا گیا کہ نئے بنائے یا بلاک جو دستیاب ہو سکیں، استعمال کر لئے جائیں - دو مُغل بادشاہوں، شاہجہان اور اورنگ زیب کی تصاویر کے لئے میں پرنس آف ویلز میوزیم آف ویسٹرن انڈیا بمبئی کے ٹرسٹیز کا مشکور ہوں، جنھوں نے اشاعت کی اجازت دیدی - دو ہوائی تصویروں کے بلاک جو ہوائی جہاز کے ذریعہ ارتفاع سے لی گئیں، فوجی اخبار شملہ کے دفتر سے خریدے گئے ہیں - صرف تین عکسی تصاویر کے بلاک نئے تیار کرائے گئے ہیں - اس میں شک نہیں کہ تصویر اور خاص طور پر چھوٹی تصویر عمارت کی عظمت اور رفعت کا معقول اندازہ نہیں بتا سکتی - اس کا تعلق صرف دیکھنے سے ہے -

کوئی انسان جس کے پہلو میں دل ہے۔ دہلی کے مضافات کی قدیم عمارات کو دیکھنے کے بعد بے ثباتی عالم پر آٹھ آٹھ آنسو روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس خطے میں کئی جگہ شہر بسے اور ہر ایک دہلی کے نام سے منسوب کیا گیا۔ تخصیص کی غرض سے ان مقامات کو مختلف ناموں سے یاد کیا جائے گا۔ جو شروع میں صفحہ نمبر ۴ پر دیئے گئے ہیں۔ ان ناموں کی منسوبہ شہروں سے مناسبت بھی ضرور ہے۔

یہ ایک مستقل مسلمہ صداقت ہے۔ کہ جو قوم قابلِ توصیف اسلاف کے کارناموں کے دوام کا سبب نہیں بن سکتی۔ وہ کبھی ایسے کارناموں کے ظہور کا باعث بھی نہیں بن سکتی جو مستقبل میں قابلِ توصیف قرار دیئے جائیں، یہی ان اوراق کا ماحصل ہے ؎

گاہے گاہے بازخواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

ف۔ محمد شجاع
بازار بلی ماراں۔ دہلی

مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۲۷ء

نقشہ جات

نمبر شمار	مضمون	مقابل صفحہ
۱	دہلی کا تاریخی علاقہ	۳
۲	دار السلطنت دہلی کا محروسہ علاقہ ۱۳۱۲ء علاء الدین خلجی کے عہد میں۔	۴۷
۳	شاہجہان آباد، یعنی موجودہ شہر دہلی	۱۲۷
۴	دار السلطنت دہلی کا محروسہ علاقہ ۱۷۰۰ء اورنگ زیب کے عہد میں	۱۳۴
۵	نئی دہلی یعنی رائے سینا کا خاکہ	۱۸۰

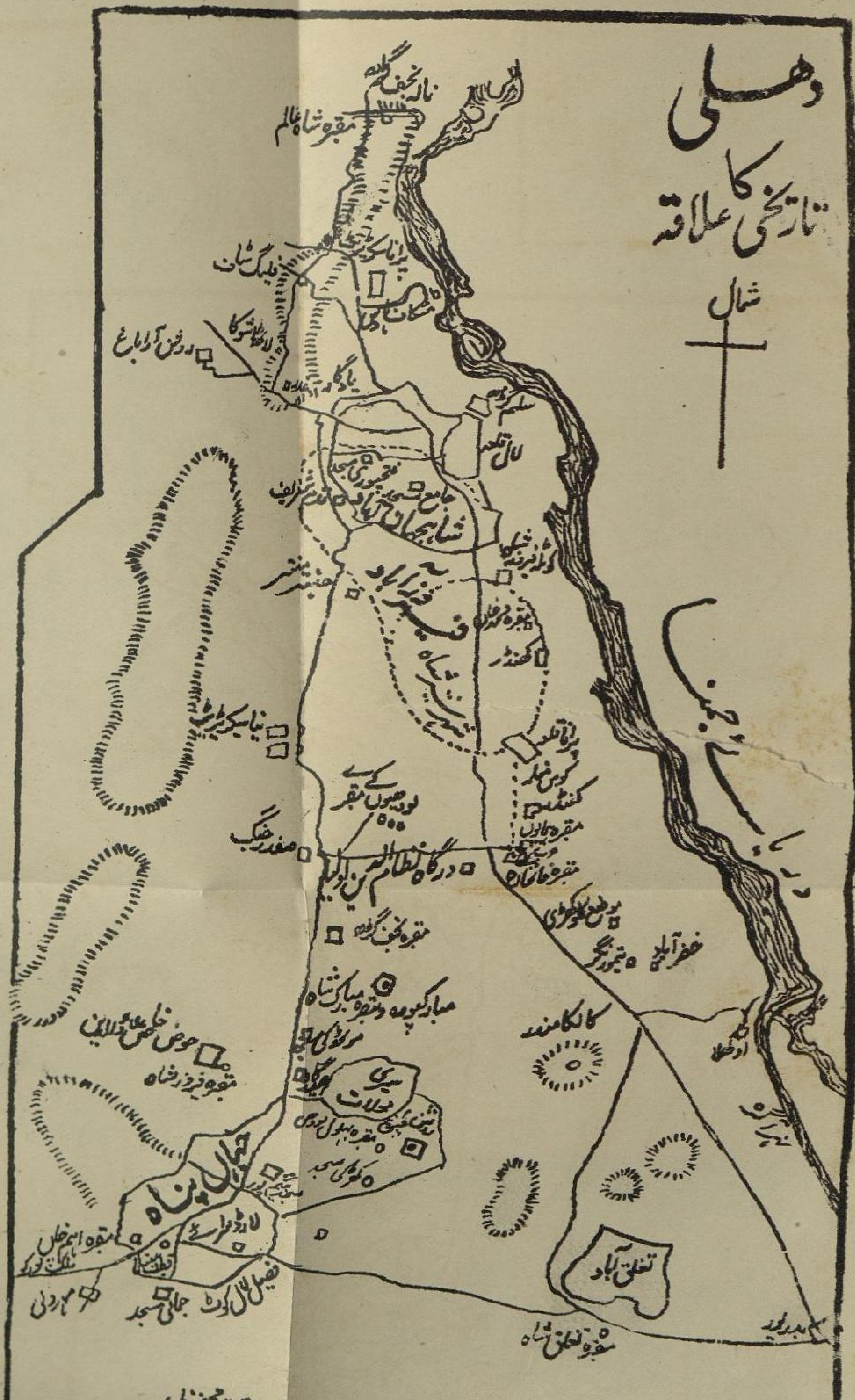
تصاویر

نمبر شمار	مضمون	مقابل صفحہ
۱	قطب مینار کا نواح	۱۶
۲	شاہ طہماسپ صفوی اور ہمایوں کی پہلی ملاقات (حالات عدود صفحہ ۱۰۰)	۳۲
۳	مغل بادشاہوں کے سکے (کیفیت سکہ جات الگ صفحہ پر مقابل صفحہ ۶۹)	۶۸
۴	تاج محل آگرہ (اندر سے)	۱۰۶
۵	مقبرہ ہمایوں	۱۱۵
۶	شاہجہان بانی تاج محل آگرہ	۱۲۸
۷	اورنگ زیب جوانی میں	۱۳۳
۸	امپیریل سکریٹیریٹ اور کونسل بلڈنگ	۱۸۲

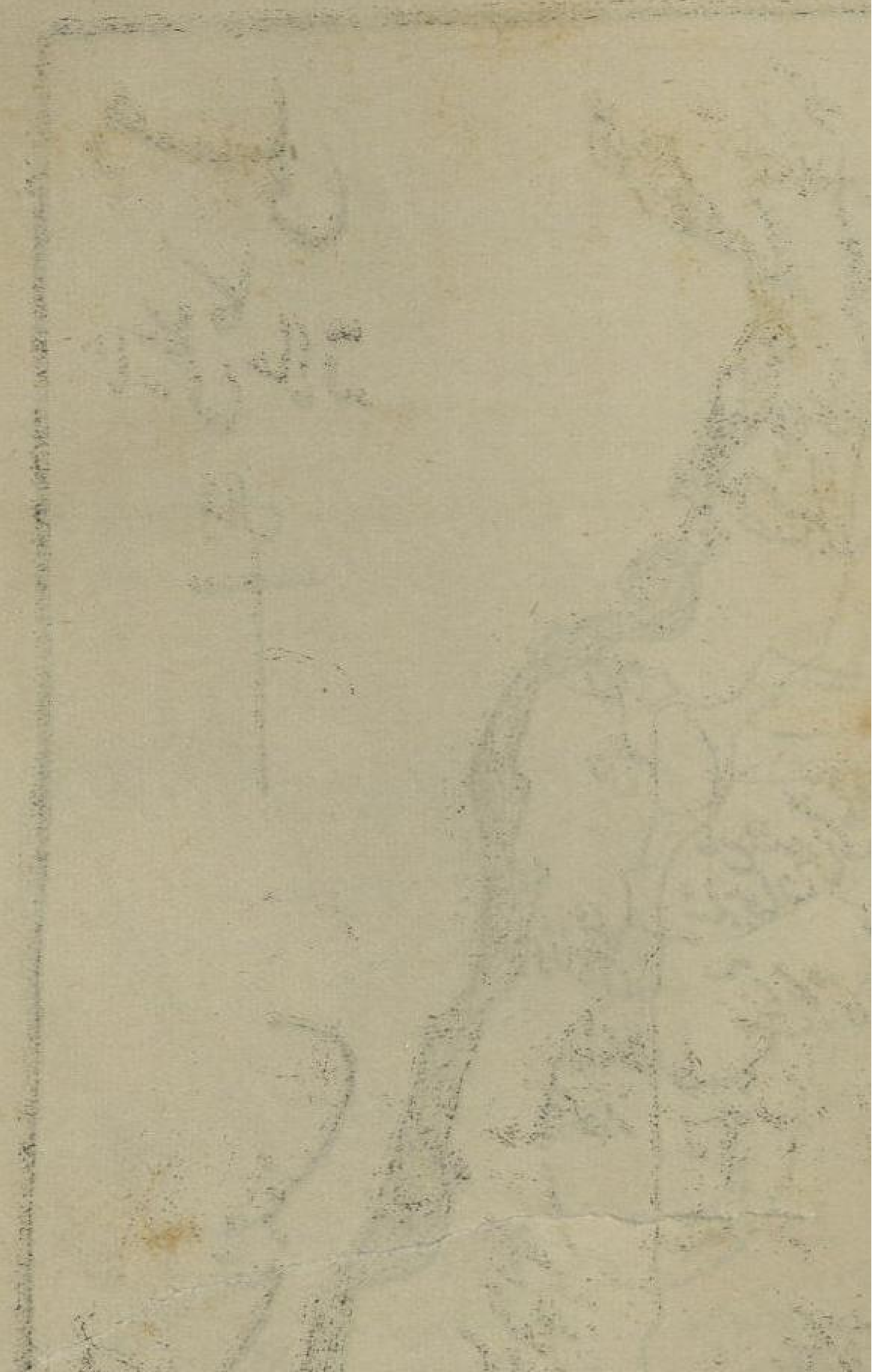
اندراجات

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
١	تمہید و تعارف و دیباچہ	(ا دج)
٢	دورِ حاضرہ	٥
٣	مختلف زمانوں میں محلِ وقوع	١٥
٤	قبل از تاریخ	١٧
٥	شہر جہاں پناہ	٢٩
٦	تغلق آباد و عادل آباد	٥٩
٧	فیروز آباد	٧٠
٨	انتقالِ دارالحکومت	٨٨
٩	شاہجہان آباد، دورِ اوّل	١٢٧
١٠	شاہجہان آباد، دورِ ثانی	١٤٩
١١	عہدِ انگریزی کی دہلی	١٧٥
١٢	مضمون نما	١٩٥

دھلی



دھلی
کا
تاریخی علاقہ
شمال
دریائے جمن
نالہ نجف گڑھ
مقبرہ شاہ عالم
فلیگ سٹاف
سلیم گڑھ
لال قلعہ
فتحپوری مسجد
جامع مسجد
شاہجہان آباد
فیروز آباد
پرانا قلعہ
صفدر جنگ
مقبرہ ہمایوں
درگاہ نظام الدین اولیا
خضر آباد
کالکا مندر
سیری
جہاں پناہ
لاڈو سرائے
مقبرہ فیروز شاہ
مہرولی
تغلق آباد
مقبرہ تغلق شاہ
(جملہ حقوق محفوظ)



مابین فاصلے میلوں میں تقریباً

کابلی دروازہ	روشن آراء	۱ میل
کشمیری دروازہ	فلیگ سٹاف	۲ ،،
کشمیری دروازہ	مقبرہ شاہ عالم	۴ ،،
کشمیری دروازہ	دہلی دروازہ	۲ ،،
دہلی دروازہ	پُرانا قلعہ	۳ ،،
دہلی دروازہ	مقبرہ ہمایوں	۴ ،،
دہلی دروازہ	تغلق آباد	۱۰ ،،
دہلی دروازہ	بدرپور	۱۲ ،،
بدرپور	تغلق آباد	۲ ،،
اجمیری دروازہ	جنتر منتر	۱ ،،
اجمیری دروازہ	مقبرہ صفدر جنگ	۴ ،،
اجمیری دروازہ	قطب مینار	۱۰ ،،
قطب مینار	تغلق آباد	۵ ،،
مقبرہ ہمایوں	مقبرہ صفدر جنگ	۲ ،،

دورِ حاضرہ

موجودہ شہر دہلی شاہجہان کا بسایا ہُوا ہے، اس لئے شاہجہان آباد کہلاتا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں اس کی بنا ڈالی گئی۔ شہر کے گرد پتھر چونے کی مستحکم فصیل ہے جسے "شہر پناہ" کہتے ہیں۔ عہد انگریزی میں اس کو مغرب کی طرف سے گرادیا گیا۔ (شہر کا نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ)

دریائے جمنا ایک چکر کاٹتا ہُوا بہتا ہے۔ اس کی ریتی شہر کی فصیلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ لال قلعہ شہر پناہ کے اندر، شہر کے ایک طرف برلب جمنا واقع ہے۔ اس سے پہلے کی دہلی کے گذشتہ واقعات کی داستان سنائی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ موجودہ باشندگان دہلی سے تعارف کرادیا جائے سیاح اور مسافر کے لئے دلچسپی کا باعث اور استفادہ کا سبب ہوگا۔

شاہی زمانے تو گئے۔ اس وقت یہ شہر امراء وزرا کا مرکز ہوگا۔ اب

دہلی کے باشندوں کا کثیر حصہ تجارت پیشہ ہے۔ باقی صنعت و حرفت سے پیٹ پالتے ہیں۔ آٹے میں نمک نواب طبقہ بھی ہے۔ نئی دہلی یعنی دورِ جدید کے ہندوستان کا دارالحکومت، رائے سینا میں شہر سے تین میل پر ہے۔ اس میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے دہلی والوں نے ابھی تک کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ سرکارِ ہند کے ملازمین تمام تر غیر شہری ہیں۔ تجارت پیشہ لوگوں کو اعلےٰ تعلیم کا شوق بھی کم ہی ہوا کرتا ہے۔ اور یہ حصولِ ملازمت کے لئے نہایت ضروری ہے۔

دہلی آج کل کے زمانے میں تجارت کی بہت بڑی منڈی ہے۔ ایک تو اس شہر کا محلِ وقوع دوسرے ریلوں کا مرکز ہونا اس غرض کے لئے بہت مفید ہے۔ یہاں سے سات ریلوے لائنیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ یہاں کے باشندوں کے اخلاق اور ذہنیت بھی ماحول کے مطابق ہو۔ دکانداروں کا تمام دن اور رات کا پہلا پہر دکان پر بیٹھے زر جمع کرنے کی فکر میں گذرتا ہے۔ جسے وہ اصطلاح میں "لاکھ پچاس ہزار جمع کرنا" کہتے ہیں۔ بازاروں میں بہت رات گئے بھی اچھی خاصی آمد و رفت رہتی ہے۔

پرانے شہر کی فصیل کے باہر پہاڑ گنج ایک اچھی خاصی بستی ہے۔ لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار بہت دور تک چلا گیا ہے۔ بڑی پُررونق

جگہ اور تجارت کی بہت بڑی منڈی ہے۔ عموماً تھوک فروشوں کی دکانیں ہیں شاہجہان آباد میں چاندنی چوک اور چاوڑی سب سے پُررونق بازار ہیں۔ چاوڑی شمالی ہندوستان کا کاغذ اور لوہے کی تجارت کا مرکز ہے۔ دھات کے برتن بھی بہت بنتے اور بکتے ہیں۔ چاندنی چوک کا نام کون نہیں جانتا بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ بازار بلّی ماراں اور دریبہ کلاں شہر کے عین مرکز میں واقع ہیں۔ جہاں صبح سے شام تک کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ دورِ جدید کے زیر اثر کشمیری دروازے کے اندر چند انگریزی طرز کی بہت معقول دکانیں معرض وجود میں آئی ہیں۔ سردیوں کے موسم میں شہر کے اندر اور گرد و نواح میں چند دن کیلئے غروب کے بعد گہری دھند ہو جاتی ہے۔ جس سے قریب کی چیز دکھائی نہیں دیتی۔

نوارد کو عوام الناس سے واسطہ پڑتا ہے۔ یوں تو ہر جگہ اچھے بُرے آدمی موجود ہوتے ہیں۔ مگر اجنبی کو مخصوص ہستیوں کی صحبت کا بہت کم موقع نصیب ہوتا ہے جبتک کہ پہلے سے واقفیت نہ ہو۔

دہلی میں کوئی بساط خانے کی چیز خریدنے کیلئے جاؤ۔ دوکاندار کبھی کبھی بے رخی سے بھی کام لیتا ہے۔ نوارد پہچان کر اکثر اوقات کسی چیز کی قیمت تین گنا تو بڑی بے تکلفی سے کہہ دیں گے۔ اگر کوئی شریف انسان ایسے غریب الوطن کی امداد کرے یعنی اُسے دھوکے اور ریا سے بچانے کی کوشش

کرے تو دکاندار صرف آپ سے خفا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ لڑائی تک نوبت آجاتی ہے۔لڑائی سے مطلب وہی زبانی زبانی طرفین میں گرم گرم تبادلۂ آداب و تسلیمات جیسے دلی والوں کا مشرب ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آپ نے میرا گاہک بگاڑ دیا۔ ان دکانداروں نے اسی کو تجارت کا اصول سمجھا ہُوا ہے۔ کہ گاہک کے سر کے ساتھ اس کی مونچھیں بھی مونڈ لی جائیں زیارت گاہوں پر بھی عجیب حال ہے۔ آپ اجنبی معلوم دیتے ہیں فقیروں اور سجادہ نشینوں سے پیچھا چُھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

دہلی کے عوام الناس، اجنبی کے مقابلے میں ایک دوسرے کے ساتھ بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمدردی تو اسے نہیں کہا جا سکتا۔ مگر لگاوٹ ضرور ہوتی ہے زبان اور لباس کی یگانگت فوراً بتا دیتی ہے۔ کہ یہ دہلی والے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ہر ایک کو اپنے وطن اور برادرانِ وطن سے محبت ہوتی ہے۔ یہ تقاضائے بشری ہے۔ لیکن مسافر اور مہمان بھی کچھ حقوق رکھتا ہے۔ نہ یہ کہ اسے غریب شہر جان کر اسکی پگڑی اتار لی جائے۔ جہاں کہیں موقعہ ہوگا دِلی والا اپنے شہر کے باشندے کی جا و بے جا حمایت کریگا۔

یہاں کی پبلک میں ایک صفت اور بھی ہے۔ جہاں پانچ سات آدمی بازار میں ایک جگہ کھڑے ہوئے اُنکے گرد، دس بیس کا اور ہجوم ہو جائیگا۔ اور انکے منہ کو دیکھنے لگے گا۔ دنگہ فساد کچھ نہ ہو۔ دوست احباب یونہی کھڑے باتیں کرتے

ہوں۔ تو ان کے گرد تھوڑی دیر میں ایک بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ جہاں چین و امن میں یہ حالت ہے۔ تو لڑائی فساد کا تو آپ خود خیال کر لیں۔ بعید از معمول ذرا سی کوئی بات ہوئی چیل کوؤں کی طرح گرتے ہیں۔ شاید انہیں دنیا میں اور کوئی کام نہیں۔ کوئی بھلا آدمی انہیں کیوں نہیں سکھاتا "بھئی اپنے کام سے غرض رکھو۔ دوسرے کے راستے میں دخل در معقولات بننا بہت بڑا عیب ہے۔

دوکانداروں پیشہ وروں کی زبان پر بلا تحقیق بھروسہ کر لینا کوتاہ اندیشی کی دلیل ہے۔ ہر کوئی قطع و برید میں خیاط اور استعمال گازمیں زرگر کی عادات رکھتا ہے۔ دکانداروں کے ادنیٰ طبقے میں نسبتاً، ہندو زیادہ محتاط اور معاملہ سنج ہیں۔ سودا فروش غیر پسندیدہ طریقوں سے اپنے سودے میں چند پیسے بڑھانے کی نئی ترکیبیں نکالتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ مسافر کثرت سے آتے ہیں، بک بھی جاتا ہے۔ اُن کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا کہ محنت کی مزدوری اور کھرے دام زرین اصول ہے۔

یہاں کے حرفت پیشہ لوگ۔ کارخندار، کاخندار (کارخانہ دار) یا "باقی دار" کہلاتے ہیں۔ چونکہ انکے سر مالک کارخانہ کی کچھ نہ کچھ رقم ہمیشہ چڑھی رہتی ہے۔ یہ لوگ اپنی کمائی کا بڑا حصہ بُری طرح فضول خرچی کی نذر کرتے ہیں۔ سال میں ایک آدھ تیوہار پر اپنی چادر پھاڑ کر شان دکھاتے ہیں۔ اور سال کا باقی حصہ اس کی

پاداش میں مقروض رہتے ہیں مستورات بھی اس عادت میں شامل ہیں پھول والوں کی سیر پر کباب پراٹھے، شب برات پر آتشبازی اور علی ہذالقیاس اک شان تصنع کو قائم رکھنے کی ہوس ہے۔

امیر مسافروں کے لئے ایک اور آفتِ جان یہاں کے ایجنٹ یا دلال ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کو فلاں چیز درکار ہے، پھر وہ کراماً کاتبین کیطرح آپ کے ساتھ ہیں۔ جبتک آپ دہلی کے کسی کونے میں ہیں وہ پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور تمام ملاقات کا ماحصل بڑا پریشان کن ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے یہاں جیب کترے بھی کثرت سے تھے۔ مگراب قانون کے سخت گیر پنجے نے ان کی تعداد میں کمی کر دی ہے۔ کچھ نئی سلطنت کا مرکز بننے سے باشندوں نے اپنی توجہ زیادہ مستحسن ذرائع معاش کی طرف منعطف کر دی ہے۔ جو اس نئے دَور میں معرضِ وجود میں آئے۔

ہر بڑے شہر کے آدمی خشک ہوتے ہیں۔ وہ اس رویہ پر بعض اسباب سے ایک حدتک مجبور بھی ہیں۔ دہلی والے حساب کے بڑے پکے اور ہر کام میں مصلحت اندیش ہیں مصلحت ہر کوئی اپنے اپنے لئے سوچتا ہے۔ یوں تو بعض ایسی ہستیوں سے بھی ملاقات کا اتفاق ہؤا، جن کا اخلاص و اخلاق قابلِ تقلید وستائش ہے۔

اپنے علم و واقفیت کے مکمّل ہونے کا کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ہر

ایک آدمی ایک خیال کو اسی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ جیسے کہ وہ اسکے ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے ممکن ہے حالات بعض آنکھوں کو مختلف نظر آئیں۔

یہاں پر حکیم اور ڈاکٹر بھی بہت ہیں۔ قدیم شاہی پایۂ تخت اور عظیم الشان شہر ہونے کے سبب صحت اور تعیّش کی غرض سے انکا ہونا لازمی ہے۔ ہر گلی اور بازار میں کئی ڈاکٹروں اور حکیموں کے بورڈ دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کے قدیم شاہی حکیموں کے خاندان نے حکمتِ یونانی کے گراں قدر سرمایہ کو اب تک محفوظ رکھا ہے۔ دور دراز سے پرانے پرانے مریض معالجے کے لئے یہاں پہونچتے ہیں۔ یہ کھلا ہوا درِ فیض قابلِ تعظیم ہے۔

جامع مسجد کے گرد ہر شام کو "مسافروں کا میلہ" بھرتا ہے۔ جسے اہلِ شہر گزرو یا راہ گزرو کا میلہ کہتے ہیں۔ اس میں نیم حکیم، بلکہ نام کے حکیم کہنا زیادہ موزوں ہوگا"۔ وہاں جان بر کہ جمٹتے ہیں۔ اور دو تین گھنٹوں میں معقول رقم پیدا کر لیتے ہیں۔ ہجوم جمع کرنے کے لے مختلف ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ کوئی شعر پڑھتا ہے۔ کوئی خوش الحانی سے غزل، کوئی فحش قصے سناتا ہے۔ تمام دوائیاں کھانے اور لگانے کی جو یہاں بکتی ہیں۔ صرف ایک ہی مرض کے علاج کے لئے ہوتی ہیں۔ انسان یہ خیال کرتا ہے۔ کہ یہاں دوسری کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

یہاں کی تفریح کے سامان اور انکا معیار باقی دنیا سے مختلف ہے رجحانِ طبیعت گھر میں محدود اشغال اور بلا تکان تفریح کی طرف زیادہ ہے۔ سارا جمنا کا

کنارہ گھوم جاؤ۔ ایک کشتی سیر کی غرض کیلئے موجود نہیں۔ سبزی منڈی کے گرد و نواح میں بہت بڑے رقبے میں باغات ہیں۔ مگر یہاں کے لوگوں پر اُن کے کسی معقول استعمال کا انکشاف ابھی تک نہیں ہو سکا۔ سوائے اسکے کہ وہاں پھل پیدا ہوں یہاں کا ایک مخصوص انداز کا مقامی خشک مذاق بھی ہے۔ جس میں حلاوت کی نسبت ترشی زیادہ ہوتی ہے۔ شیر خوار سے لیکر ہفتاد سالہ تک "عیش" کی فکر میں رہتے ہیں۔ عادتاً ایک شغل ہے۔

ایک پہر رات سے جمنا کے کنارے اچھا خاصہ میلہ لگ جاتا ہے اشنان کرنے والوں کا تانتا بندھ جاتا ہے جن میں طبقۂ اناث زیادہ ہوتا ہے، جمنا مائی کے پوتر جل سے پاپ کھارے جاتے ہیں۔ اور دھن لابھ کی پرارتھنا ہوتی ہے دریا کے کنارے اور راستے میں بہت سی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اور چھوٹے بڑے کئی مندر بنے ہوئے ہیں۔ تیوہار پورنماشی وغیرہ پر ہجوم بہت زیادہ ہوتا ہے اور بہت دن چڑھے تک رہتا ہے۔ کیلے گھاٹ اور نگمبودھ گھاٹ کے باہر ریل کے پُل تک دریا کے کنارے پھوس کے جھونپڑوں کی ایک مستقل بستی آباد ہے۔

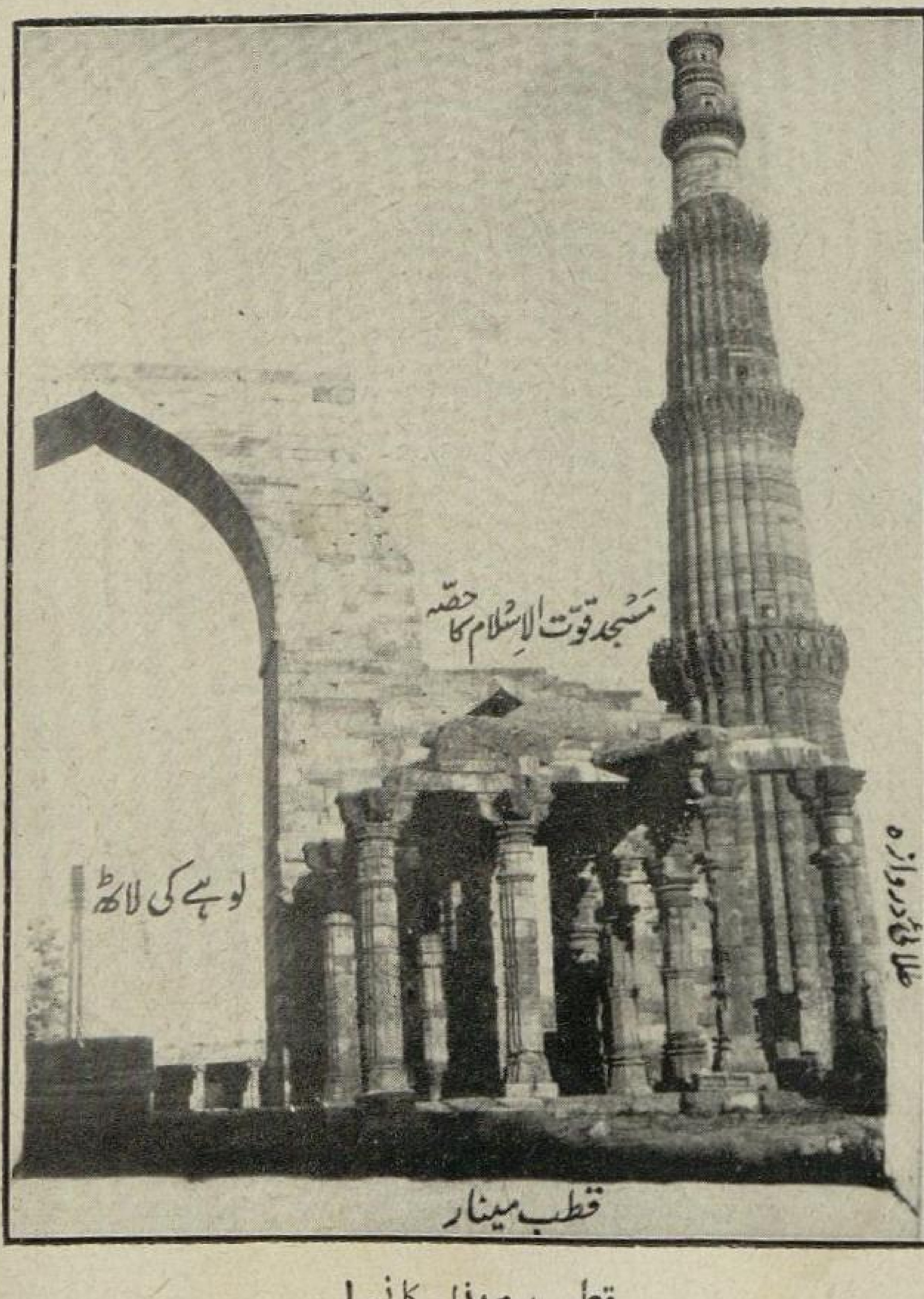
پنجاب کی نسبت دہلی والے مرچیں زیادہ کھاتے ہیں۔ اور بہت ہی زیادہ کھٹائی کا کافی استعمال ہے۔ پان تو تمام ممالک متحدہ میں بکثرت مستعمل ہے۔ مگر یہاں کی عورتوں کو اس کا سودا ہے۔

اردو زبان کے دو مرکز ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ۔ دونوں کے محاورات اور تذکیر و تانیث میں کہیں ذرا سا فرق ہے۔ اس میں شک نہیں یہاں بعض ہستیوں کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ بازاری لونڈوں پہ نہ جاؤ۔ "او میاں شہابو' دیکھیو' دِن (اُن) کی جنگا (جگہ) نکڑ کنے اپنا (یعنی ہمارا) قبوتر (کبوتر) بیٹھ ریا (رہا) ہے۔ بارو فتّر! (پتھر) پنجاب نے بہت اثر کیا ہے۔ بلکہ تجارت اور سلطنت کا مرکز ہونے کے سبب ہر صوبہ یہاں موجود ہے۔ اہل دہلی نے قیق جزو اخذ کر لئے ہیں زبان کے لئے کسی اہل زبان سے سنو۔ جس کی زبان اپنے گھر کی ہو، حلاوت کا مزا برسوں نہیں جائیگا۔

جب دہلی جیتی تھی۔ یہاں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ فتوحات اور فوج کشی کے تمام مراحل طے ہوئے۔ تو اس کی نوبت آ گئی۔ اب یہ رسم اندازے سے بڑھ گئی ہے۔ ہر گلی کوچے میں پانچ سات شاعر مل جاتے ہیں۔ جو ذات پات حسب نسب سے بالکل "شاعر" ہوتے ہیں۔ محفلیں اور ہنگامے بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ عروج کے زمانے میں دہلی اہل کمال کا مسکن تھی۔ صنعت اور حکمت کے اُستاد یہاں رہتے تھے۔ اب بھی زرگروں اور سادہ کاروں کی دستکاری کے نمونے اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ جوہریوں کی دکانیں بھی بہت ہیں۔ ہاتھی دانت گوٹے پٹھے کا کام بے مثل بنتا ہے۔

دِلّی حقیقتاً بہت سی دلچسپیوں کا مرکز اور دلپسند جگہ ہے۔ شاید اس کا نام

اسی لئے دِلّی مقرر ہُوا۔ کہ دل لینے میں یکتائے روزگار ہے۔ دِل ی۔ پلٹتے وقت کسی بھلے آدمی کا دل اس کے ساتھ واپس نہیں گیا ہوگا۔ دل لینے والی۔ دِلّی۔ ایک مخصوص تہذیب کا مرکز اور انداز و ملاحت کا معدن ہے۔ روش تراش ہونا تو اس کی قدیم صفت ہے۔ کئی انجمنوں، سوسائیٹیوں کا صدر مقام ہے۔ مذہبی مدارس بھی ہیں۔ طبیّہ کالج بھی ہے۔ ان میں تعلیم کے لئے دور دور سے آکر شاگرد زانوئے ادب تہ کرتے ہیں +



قطب مینار کا نواح

۴۔ ہندوستان کے

دارالسلطنت

کا خطۂ دہلی میں مختلف زمانوں میں محل وقوع

سنہ	محل وقوع	بانی	شہر کا نام	نمبر
سنہ ۱۴۵۰ قبل مسیح	مقام پرانا قلعہ	یدھشٹر	اندر پت	۱
سنہ ۱۰۸۰ء	اطرافِ قطب مینار	پرتھی راج چوہان	قلعہ رائے پتھورا (یا لال کوٹ)	۲
سنہ ۱۲۸۶ء	مقبرۂ ہمایوں اور اوکھلے کے درمیان	معزالدین کیقباد غلامان	کلوکھڑی *	
سنہ ۱۳۰۳ء	قطب کے شمال میں	علاؤالدین خلجی	سیری	۳
سنہ ۱۳۲۱ء	قطب کے مشرق میں ۵ میل پر	غیاث الدین تغلق اول	تغلق آباد	۴
سنہ ۱۳۲۵ء	تغلق آباد کے پاس، جنوب مشرق میں	محمد بن تغلق	عادل آباد	۵
سنہ ۱۳۲۷ء	لال کوٹ اور سیری کے گرد مشترکہ فصیل	" " "	جہاں پناہ	
سنہ ۱۳۲۷ء	شاہجہان آباد کے جنوب میں	فیروز شاہ تغلق	فیروز آباد	۶
سنہ ۱۴۱۸ء	اوکھلے اور ہمایوں کے مقبرے کے درمیان	خضر خاں سید	خضر آباد *	
سنہ ۱۴۳۲ء	برلبِ دریائے جمن	مبارک شاہ ثانی سید	مبارک آباد	
سنہ ۱۵۳۳ء	شاہجہان آباد کے جنوب میں تین میل پر	ہمایوں مغل	پرانا قلعہ	
سنہ ۱۵۴۶ء	لال قلعے کے کونے پر	اسلام شاہ سور	سلیم گڑھ	
سنہ ۱۶۴۸ء	دہلی شہر موجودہ	شاہجہان مغل	شاہجہان آباد	۷
سنہ ۱۹۱۱ء	رائے سینا۔ شاہجہان آباد سے تین میل پر	حکمرانِ انگریزی	دہلی جدید	۸

+ غیر اہم مقامات پر یا ایک مقام کے دوبارہ آباد ہونے پر، نمبر نہیں دیا گیا،

* نسبتی محلِ وقوع کے لئے نقشہ ملاحظہ ہو (صفحہ)

* صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔

ے اس سن میں تعمیر شروع ہوئی۔

ہندوستان کے دار السلطنت

دہلی

کی مجمل سرگذشت

۱۔ قبل از تاریخ

دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا!

یوں تو عالم کا ذرّہ ذرّہ انقلاب کے پیچ وتاب میں ہے۔ مگر قسام ازل نے دیگر ودیعتوں کی طرح، بعض خطوں کی قسمت میں آشوب اور پریشانی کا حِصّہ زیادہ رکھا ہے۔ دہلی کی تاریخ ایک پُردرد حقیقت ہے جسرت آفرین کہانی ہے۔ عبرت انگیز افسانہ ہے۔

یہ سچ ہے۔ کہ تحت الثرٰی سے رفعتِ ثریا تک پہنچنا قابلِ فخر و باعثِ عزت ہے۔ مگر اس ارتفاع سے فرش خاک پر گرنا ایک یاس انگیز نظّارہ ہے۔ بننے

کو صدیاں اور بیسیوں قابل دماغوں کی ضرورت ہے۔ مگر بگاڑنے کو ایک نادر شاہ کی ذات اور صرف دو پہر کا عرصہ درکار ہے جس قدر پے در پے انقلاب اور زمانے کی نیرنگیاں دہلی کے حصے میں آئی ہیں۔ شاید ہی کوئی شہر روئے زمین پر ایسا ہوگا۔ جو ان کا متحمل ہو سکا ہو۔

دہلی کی عظمت اور قدامت کا مقابلہ دنیا کے قدیم ترین شہروں مثلاً نینوہ بابل سے کیا جاتا ہے۔ اس کی سیاسی اہمیت اور تمدنی حیثیت روما بغداد سے کسی طرح کم نہیں۔ عمارتوں کی صناعی، تاریخی فوقیت اور موجودہ فضیلت کے سبب دنیا کے مشہور شہروں مثلاً ایتھنز، قاہرہ، وینس، قسطنطنیہ میں اس کا شمار ہے۔ نسل آدم کی رہائش اور استعمال کے بعض پتھر سے بنائے ہوئے افضل ترین نمونے دہلی میں موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان بھر میں تاریخی لحاظ سے یہ سب سے دلچسپ اور افضل شہر ہے۔

موجودہ دہلی شہر (شاہجہاں آباد) سے ملحقہ روئے زمین کا وہ خطہ جو دریائے جمنا کے مغربی کنارے اور سلسلۂ کوہ اراولی کے درمیان واقع ہے۔ یکے بعد دیگرے کئی شہروں کا محلِ وقوع بن چکا ہے۔ اس کا طول کوئی ۱۵ میل کے قریب ہوگا اب اس خطے میں بوسیدہ کھنڈرات، چپے چپے پر پرانے قبے، ٹوٹی پھوٹی قبریں، گری پڑی دیواریں، مسمار قلعے اور منہدم فصیلیں گذشتہ عظمت کا پتہ دیتی ہیں۔ دم بخود پتھر خاموش نغموں میں عبرت کے افسانے گا رہے ہیں۔ چشم بصیرت

ان سے سبق حاصل کرتی ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا   غالب

نام دِلّی تو کوئی ۳۰۰ء سے تاریخ کی کتابوں میں آنا شروع ہوا ہے جسے مسلمانوں نے آکر دہلی کہنا شروع کیا۔ اور انگریزی میں "ڈیلہی" ہوگئی اس سے قبل یہاں پر جو شہر آباد تھے۔ ان کے نام مختلف تھے۔ سب سے قدیم ترین تاریخی ثبوت جو اس خطے میں آبادی کا ملتا ہے۔ وہ ۱۴۵۰ء قبل مسیح ہے۔ جب یدھشٹر نے پرانے قلعے کے مقام پر ایک اندرپرست نامی شہر بسایا۔ مگر اس سے پہلے بھی یہاں پر آبادی ضرور موجود تھی۔ یہ سلسلہ اس قدر قدیم ہے۔ کہ تاریخی صحیفے ہمیں زمانے کے متعین کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتے اور اس کی ابتدا قدامت کی تاریکی میں گم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ہماری عقلِ رسا کام کرتی ہے۔ اس خطے میں کہیں نہ کہیں ایک عظیم الشان شہر کا نشان ملتا ہے۔ سورمیر راجے، ادھیراج مہاراجے عظیم الشان بادشاہ اور جلیل القدر شہنشاہ اس خاک سے اٹھے۔ اور پھر اسی میں مل گئے۔ یہ ان سریرآراؤں کو کہاں کہاں سے کھینچ کر لے آئی جنھوں نے اس کو اپنا پایہ تخت بنانا فخر خیال کیا۔

دہلی بہت قدیم زمانے سے ہندوستان کی سیاسی فضا پر قابض رہی ہے۔ گردونواح کے شہروں کی ذاتی طور پر کوئی تاریخ نہیں۔ چونکہ اُن کی

سیاسی اور ملکی وابستگی دہلی سے اس قدر تھی۔ کہ دہلی کی فضا ان تمام پر حاوی تھی۔ اور وہ معاشرتی تمدنی غرض تمام پہلوؤں سے اسکے زیر اثر تھے۔ اسلئے شہر دہلی کی تاریخ تمام گرد و نواح کی تاریخ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بہت بجا ہوگا کہ دہلی کی تاریخ ملکِ ہندوستان کی اجمالی تاریخ ہے۔

یہ شہر کوئی صحت افزا مقام نہیں۔ جہاں پر قدیم زمانے میں لوگ طبی نکتۂ خیال سے آتے ہوں۔ نہ ہی کوئی ایسی تفریح گاہ ہے۔ کہ تفریح کے خیال سے قابل توجہ ہو۔ دہلی مرتفع میدان پر واقع ہے۔ گرمیوں میں اچھی خاصی گرمی پڑتی ہے۔ مئی اور جون کا اوسط درجۂ حرارت ایک سو چار کے قریب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ جب بہت گرمی پڑی تھی۔ تو جون کے مہینے میں مقیاس الحرارت کا ربع اونچا حسب ۱۲۰٫۵ درجے ہو گیا تھا۔ نہیں تو ۱۱۲ کے قریب رہتا ہے۔

زمستان میں سردی شدید نہیں ہوتی۔ جنوری اور فروری کا اوسط اقل اڑتالیس کے قریب ہوتا ہے۔ اگر صرف ان کے ماہواری کمترین حسابات کی اوسط لی جائے۔ تو کوئی ۴۲ کے قریب آتی ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جب تمام ہندوستان میں کانگڑے کا جوالا مکھی پھٹنے سے پہلے بہت سردی پڑی تھی۔ تو دہلی کا اقل ۲۲٫۵ درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ درجہ حرارت میں روزانہ تفاوت جولائی۔ اگست ستمبر میں پندرہ درجوں کے قریب اور جون کو چھوڑ کر باقی مہینوں میں ۲۵ کے قریب ہوتا ہے۔ موسم زمستان پنجاب کے میدانی علاقوں سے مشابہت رکھتا ہے صرف

یہ کہ جاڑا کوئی پندرہ بیس دن پہلے واپس ہو جاتا ہے۔ اپریل کے مہینے میں ہوا سب سے خشک ہوتی ہے۔ لیکن آسمان اکتوبر کے مہینے میں سال بھر میں زیادہ صاف ہوتا ہے نسبتی رطوبت دسمبر جنوری۔ فروری میں ساٹھ و ستر کے درمیان اور جولائی اگست ستمبر میں ستر فیصدی سے اوپر ہوتی ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ دہلی کی ہوا مرطوب ہے۔ جو صحت کے لئے بہت مفید نہیں۔ جولائی اور اگست کے مہینے میں جب ساون کی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں۔ آسماں ہمیشہ نصف سے زیادہ بادل سے ڈھکا رہتا ہے اور ہر مہینے میں نو دن کے قریب بارش ہوتی ہے۔ گرمیوں کے چار مہینوں میں سال بھر کی ۲۷ انچ بارش میں سے ۲۲ انچ کے قریب برس جاتی ہے جنوری میں ایک انچ باقی سال بھر میں بہت قلیل بارش ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اگست کے مہینے میں جب زور کی بارش ہوئی۔ تو ایک دن میں سات انچ سے اوپر تھی۔ جولائی کو چھوڑ کر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ مہینہ بھر بوند بھی نہ پڑے ہوا عموماً آہستہ چلتی ہے۔ اور سمت شمال مغرب یا جنوب مغرب ہوتی ہے۔ اسکا یہ مطلب ہوا کہ ہوائیں مغرب کے سلسلۂ کوہ کے اوپر سے ہو کر آتی ہیں۔ گو عرصۂ تحقیق بہت دراز مدت پر مشتمل نہیں لیکن دورِ جدید کی علم حوادث الجویہ کے معطیات کا استدلال یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ امتدادِ زمانہ سے کسی مقام کی آب و ہوا کے عناصر پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یعنی بہت قدیم

زمانے میں بھی دہلی کی آب و ہوا ایسی ہی تھی جیسی کہ اب ہے۔

یہ شہر ۳۹-۲۸ شمال ۱۶-۷۷ مشرق ہندوستان کے وسط میں واقع ہے۔ اوسط سطح سمندر سے اونچائی سوا سات سو فٹ کے قریب ہے۔ اس کا فاصلہ کلکتہ سے ۹۵۶ میل، بمبئی سے ۹۸۲ میل، کراچی سے ۹۷۷ میل اور پشاور سے ۵۸۵ میل ہے۔ دریائے جمنا اس کے قریب سے بہتا ہے جس میں سے نہریں نکلنے کے سبب پانی قدیم زمانے سے بہت کم ہے۔ کوہ اردلی کا سلسلہ موجودہ ملکی تقسیم کی رو سے ضلع دہلی، کے وسط میں سے ہو کر نکلتا ہے۔ اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں۔ ان میں سے ایک غدر کی مشہور رِج (پشتِ کوہ) ہے! جو سطح مرتفع کی شکل میں ½ میل کے قریب چوڑی ہے۔ یہ حصہ پتھریلہ ہے۔ اور اس پر سبزی کم ہے۔ دہلی کے تمام علاقے میں بڑے بڑے درختوں کی کمی ہے۔

مگر سارے ہندوستان کو چھوڑ کر سلاطین نے اس کو دارالسلطنت بنانا پسند کیا۔ اور اس سے کچھ ایسی الفت ہو گئی۔ کہ یہ مراسمِ محبت کوششِ ترک سے بھی ترک نہ ہو سکے۔ جہاں تک نسلِ آدم کا حافظہ یاوری کرتا ہے۔ یہاں انسانوں کی کوئی نہ کوئی آبادی نظر آتی ہے جب سے علم انسانی نے خیالات کو تحریر کی قید میں لانا شروع کیا ہے۔ دہلی کی بستی بنی نوع آدم کی ملجا و ماوا دکھائی دیتی ہے بادشاہوں نے اس مخصوص مقام کو پسند کیا۔ بار بار ادھر اُدھر سے گھوم کر پھر

اسی مایۂ نازجائے امان پر آکر دم لیا۔

خطۂ دہلی مثلث کی شکل کا ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۔ ۷ مربع میل ہے اس تکون قطعہ کا مشرقی ضلع دریائے جمنا ہے۔ مغرب میں سلسلہ کوہ ارولی کی چند آخری شاخیں ہیں۔ جن میں ایک غدر کی مشہور پشت کوہ بھی ہے۔ اس تکون کا راس شمال کی طرف ہے۔ جہاں قدیم شہر وزیر آباد کے مقام پر یہ کوہستانی سلسلہ جمنا سے جاکر ٹکراتا ہے۔ قاعدہ چھوٹی چھوٹی چٹانوں کا منتشر شدہ کوہ ارولی کا سلسلہ ہے۔ جو مشرق مغرب واقع ہے۔ اور دونوں ضلعوں کو قطع کرتا ہوا دریائے جمنا تک پہنچتا ہے۔ تغلق آباد، عادل آباد۔ کالکا کے مندر کی پہاڑیاں اسی میں شامل ہیں۔ شاہجہان آباد یعنی موجودہ دہلی کا شہر قاعدے سے بہت اوپر تکون کے آر پار ایک ضلع سے لیکر دوسرے تک پھیلا ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں۔ کہ دریانے دہلی کے شہروں کا مقام معین کرنے میں معقول حصہ لیا ہے۔ لیکن اسی مقام کو منتخب کرنا کیا ضرور تھا۔ ایک اہم سبب اس سرزمین کی جغرافی خوبی معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف دریا دوسری طرف پہاڑوں کا سلسلہ۔ گو موجودہ مفروضہ ترقی کے زمانے میں جب انسانی زندگی کی ہلاکت کے لئے بہت سی زہریلی گیسیں اور بھاری توپیں موجود ہیں ان حفاظتوں کو وقعت نہ دی جائے۔ مگر اُس وقت یہ خاص معنی رکھتی تھیں

یہ تمام پہاڑیوں کی چٹانیں کئی دفعہ لڑائی اور مدافعت کا باعث اور سامان بن چکی ہیں۔ اس علاقے کے مغرب کی طرف ہندوستان کا تمام میدانی حصہ پھیلا ہؤا ہے جس میں دور تک قدرتی مدافعت کا کوئی سامان نہیں۔ غالباً اسی لئے شمال کی طرف سے آنے والے قدیم فاتحین نے یہاں آکر قیام کر دیا۔ ایک دفعہ شہر بن گیا۔ پھر اس میں اضافے ہوتے گئے۔ یہ وہم پرستی عوام الناس کے دلوں میں اس قدر سمائی ہوئی تھی۔ کہ جو کوئی صاحب تخت دہلی پہ قابض نہ ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان کا بادشاہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یوں تو بُعد کی ظلمات کے سبب کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کہ یہاں پر آبادی کس وقت سے شروع ہوئی۔ تاہم مہابھارت کی روایت کے مطابق پانڈوں کے بڑے بھائی اور سردار راجہ یدھشٹر نے یہاں پر ایک شہر بسا کر اس کا نام "اُندر پرست" رکھا۔

جب کورو اور پانڈوؤں میں سلطنت کی تقسیم ہوئی۔ تو پانڈو کو وہ حصہ دیا گیا جہاں پر ایک بڑا صحرا تھا۔ یہاں پر یدھشٹر نے "اندر پرست" بسایا اور اُسے دارالحکومت ٹھہرایا۔ اس میں عظیم الشان قصر اور دلکشا باغ تھے جس کے سبب اسے عالم خاکی کا بہشت لکھا ہے۔ دہلی کی خاک ہمیشہ سے عزیز رہی۔ اس کی تعریف میں پانڈوں سے لیکر شاہجہان تک خمار کی ترنگ ایک ہی ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است ہمین است وہمین است

مہابھارت میں اسے سب سے بڑا شہر شمار کیا گیا ہے۔ اس شہر کے اور نام بھی تھے۔ مثلاً سکرت پرست۔ سکر پوری۔ ست کرت پرست جو کہ اندر پرست کے مترادف ہیں۔ اس شہر میں کرو فر کے جلسے اور قیامت خیز مجلس آرائیاں ہوئیں۔ رشک گلزار اور جنت ثانی تھا۔ مہاراج اندر کی پریوں کا اکھاڑا یہی تو تھا۔ سمجھ لو کیا ہوگا۔

اس شہر کا محلِ وقوع پرانا قلعہ تھا۔ (نقشہ ملاحظہ ہو) جو موجودہ دہلی سے تین میل پر ہے۔ مگر اب اس پرانی عمارت کا کوئی نشان باقی نہیں فقط نام ہی نام کتابوں میں موجود ہے۔ وہ تمام عالیشان محل اور فلک بوس قصر خاک ہوگئے۔ اور اب انکے نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ پرانے قلعے کی فصیل ہمایوں نے بنوائی تھی۔ اور "دین پناہ" نام رکھا تھا بعد میں اس کی مرمت درستی اور اضافے شیر شاہ کے عہد میں ہوئے۔ اب وہ مقام تو موجود ہے مگر اس کی عظمت کے ثبوت میں صرف تحریری صحیفے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ کتابوں کے ورق پتہ دیتے ہیں کہ عظمت و شان کا ایک شہر یہاں پر بستا تھا۔ لیکن خاک کے ساتھ ملکر خاک ہوگیا اس کو بنے صرف ۴۳ صدیاں گذری ہیں۔ اور یہ حال ہوگیا ہے۔ تمام زر و جواہرات زمانے کی لوٹ کھسوٹ سے، خدا بہتر جانتا ہے، کہاں

کہاں پہنچے۔ سچ یہ ہے کہ یہ ساری دنیا ہی چار دن کی بہار ہے ؂

دھن دولت آنی جانی ہے   یہ ساری رام کہانی ہے
یہ عالم، عالمِ فانی ہے   باقی ہے ذاتِ خدا بابا

ذرا چشمِ دوربین سے کام لو۔ صفحۂ ہستی پر اب اندر پرست کا نشان تک باقی نہیں ہے۔ وہ عالیشان محل اور دلفریب منظر جو ہم آج دیکھتے ہیں۔ ان کا بھی ایک دن یہی حشر ہوگا۔ صرف مدت کی طوالت کا تفاوت ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اندر پرست کی طرح یہ بھی افسانہ و کہانیاں ہونگے ؂

آنہا کہ کہن شدند و آنہاں کہ نَو آند   ہر یک بمرادِ خویش یک یک برسند
ایں سفلہ جہاں بکس نماند جاوید   رفتند و روند و دیگر آیند و روند

عمرؔ خیام

اس سے پہلے کے زمانے کے لئے تحریری صحیفے ہماری یاوری نہیں کرتے نہیں تو خدا جانے کیا کیا تھا جس کا نشان مٹ گیا۔ ہر پیدائش موت کا پیش خیمہ ہے۔ ہر تنفس میں فنا مضمر ہے۔ جو آیا ہے وہ ضرور کسی نہ کسی راستے سے جائے گا۔ سنا ہے دنیا میں طویل قد و قامت کے انسان بھی ایک دور قدیم میں ہو چکے ہیں۔ بڑے قوی ہیکل اور گرانڈیل، کئی سو سال تک جئے مگر آخر فنا کا جام پیا۔ فنا ہر ایک کی لازمی منزل ہے۔ اس سفر کا انجام یہی ہے۔ جہاں تک ہماری تجسس کی نگاہیں کام کرتی ہیں یہی

چکر ہے۔ کھیل بنتے اور بگڑتے نظر آتے ہیں۔ ہماری عمریں "لا انتہا" کے مقابلے میں صفر کے برابر ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا کب ظہور میں آئی اور کبتک رہے گی؟

بھٹکتے پھرتے ہیں لاکھوں پنڈت ہزاروں دانا کروڑوں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے نظیر

ایک سو سال یا پانسو سال کا زمانہ اس مدّت دراز کے مقابلے میں جب سے دنیا معرضِ وجود میں آئی ہے، مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاتی مقابلے میں تفاوت ہو مگر نسبت سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اپنی اپنی باری فراموش ہونا ہر ایک کی قسمت میں ہے۔ زمانے کی دستبرد سے مٹنا لابدی ہے۔ دہلی کی تاریخ میں اندر پرست کی کہانی کو قرن قرن کے بعد دُھرایا گیا ہے۔ ہزاروں خاک سے اٹھے۔ باری باری اپنے رعب اور ہوس سے عالم کو زیر وزبر کیا۔ اور چل بسے مگر خاکِ دہلی وہیں کی وہیں موجود ہے یہ عالمِ فانی چڑھتی ڈھلتی چھاؤں ہے۔

دہر بے ثبات ہے یاں تو ذی حیات ہے
اور فنا کا جام ہے جس کو یاں دوام ہے
بس خدا کی ذات ہے منغمی

مؤرّخ فرشتہ جو محمّد بن تغلق کے عہد (۱۳۲۴ء سے ۱۳۵۱ء) میں موجود

تھا، لکھتا ہے کہ اس شہر کو سکندری حملے (۳۲۷ قبل مسیح) سے پہلے راجہ دہلو نے بسایا تھا۔ اس شہر کا نام دِلّی ہونے کی بھی بہت سی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ راجہ دِلّو یا دہلو نے بسایا تھا۔ اس لئے دِلّی یا دہلی کہلایا۔ لوہے کی لاٹھ راجہ اننگ پال نے گاڑی تھی جو کہ ڈھیلی رہی۔ اس لئے شہر ڈھیلی یا دہلی ہوگیا۔ دِل ہندی میں سطح مرتفع کو کہتے ہیں اور چونکہ یہ شہر ایک مرتفع خطّے پر بسایا۔ اس لئے اس کا نام دِلّی ہوُا +

۵۔ شہر جہاں پناہ

تاریخی حیثیت سے دہلی کی اہمیت گیارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ جب اننگ پال نے ۱۰۸۰ء میں سرخ پتھر کا ایک قلعہ بنایا۔ اسکو "لال کوٹ" بھی کہتے ہیں۔ اب قطب صاحب کی لاٹھ اس قلعے کے محل وقوع کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس کی فصیل کے نشان اس مقام کے گرد اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اسی راجہ نے ۱۰۵۲ء میں لوہے کی لاٹھ غالباً متھرا سے لاکر یہاں گاڑی تھی۔ کیمیائی تجزیہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ یہ لوہا ہے مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اسکو زنگ نہیں لگا۔ گویا اس لوہے کی کیمیائی بناوٹ اسطرح کی ہے جسے زنگ نہیں لگتا۔ مشہور ہے کہ جب لوہے کی لاٹھ یہاں گاڑی گئی۔ تو پنڈتوں نے کہا کہ ہم نے لاٹھ کے نیچے کا سرا سانپوں کے بادشاہ شیش ناگ کے سر پر رکھدیا ہے۔ اور اب مہاراج کی سلطنت تا قیامت قائم رہے گی لیکن راجہ کو یقین نہ آیا حکم دیا کہ اس کو اکھاڑ کر دیکھو۔ کہتے ہیں لاٹھ کے نیچے تازہ خون لگا ہوا تھا۔ مگر وہ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ ضعفِ اعتقاد اور کمزور ایمانی کی پاداش میں دیوتاؤں کی لعنت سے

اس راجہ کی سلطنت جلد تباہ ہوگئی بعض کا خیال ہے کہ اسی سبب سے اس شہر کا نام ڈھیلی یا دہلی ہوا - لوہے کی لاٹھ قطب مینار کے بالکل قریب کھڑی ہے -

لوہے کی لاٹھ دھات کی ٹھوس بنی ہوئی ہے - جس کو کوٹ کوٹ کر بنایا گیا ہے - اس کا قطر ۱۶ انچ ہے ۲۳ فٹ زمین کے باہر اور تین فٹ زمین کے اندر ہے - اس کو مضبوطی سے پختہ چونے اور پتھر میں گاڑا گیا ہے حیرت ہوتی ہے - کہ اس زمانے میں اتنی بڑی دھات کی لاٹھ ایک جان بنالی گئی ! انگ پال بہت بڑا راجہ نہیں تھا - اس کی سلطنت ہانسی ، گنگا اور آگرے تک تھی - اسکے خاندان میں دہلی کی سلطنت کوئی سو برس تک رہی - بعد میں چوہان راجپوتوں کے ہاتھ آئی - اس نے شہر کے گرد فصیل بنوائی اور کچھ تالاب شہر کے جنوب مشرق میں آٹھ میل کے فاصلے پر بنوائے -

چوہانوں نے ۱۱۵۱ء میں دہلی فتح کی - پرتھی راج چوہان راجپوتوں کا سردار اور دہلی کا فرمانروا تھا ، اسے رائے پتھورا بھی کہتے ہیں - اس نے شہر کو بڑھایا - اسکے گرد پختہ فصیل بنوائی - لال کوٹ اسکے اندر بطور قلعہ کے ہوگیا - اس شہر کی فصیلوں کے اب صرف ٹوٹے پھوٹے نشان ملتے ہیں - لال کوٹ کی فصیل کے نیچے خندق تھی فصیل کی دیواریں ۲۸ فٹ سے ۳۰ فٹ تک چوڑی اور خندق کو چھوڑ کر زمین سے ساٹھ فٹ بلند تھیں مورچے کے برج ساٹھ فٹ

دہلی (از کتاب ایوان)



شاہ طہماسپ صفوی اور ہمایوں کی پہلی ملاقات

سے لیکر سو فٹ تک قطر میں تھے۔ تیمور اپنی تو زک میں لکھتا ہے۔ کہ اس کے دس دروازے تھے۔ اب بھی اس کی فصیلیں کافی لمبائی میں موجود ہیں۔ مسلمانوں نے آکر اس میں اور اضافے کئے اور زیادہ مستحکم بنا دیا۔

پرتھی راج نے متعدد منادر لوہے کی لاٹھ کے گرد مختلف دیوتاؤں کے نام پر، بڑی صنعت اور کاریگری کے بنوائے تھے۔ مسلمانوں نے فتح کے بعد ان سب کو توڑ دیا اب ان کا کچھ کچھ نشان کھمبوں اور دیواروں سے ملتا ہے۔ جو لوہے کی لاٹھ کے ساتھ واقع ہیں۔

رائے پتھورا کا نام ہندوستان کی تاریخ میں اس لحاظ سے زیادہ مشہور ہے کہ اس نے مسلمانوں کے ابتدائی حملوں کی روک تھام کی۔ بڑا دلاور اور منچلا راجپوت تھا۔ شہاب الدین محمدؐ غوری غزنی کا حاکم ہوا۔ چونکہ علاقہ غور کا رہنے والا تھا۔ اسلئے غوری کہلایا۔ وہ ہندوستان میں فوج لیکر آیا۔ اور اس نے سرہند کا قلعہ فتح کیا۔ رائے پتھورا نے اپنے پرچم کے نیچے سو کے قریب راجے اکٹھے کئے۔ اور جبکہ غوری واپسی کا ارادہ کر رہا تھا، جنگ کے ارادے سے شمالی ہند کی طرف بڑھا۔ مقام تلاوڑی پر جو تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلے پر ہے ۱۱۹۱ء میں لڑائی ہوئی شہاب الدین مجروح ہوا فوج کے سپاہی منتشر ہو گئے ہندوستان نہ اس کی جاگیر تھی نہ وطن، غوری غزنیں واپس چلا گیا۔ اسکے بعد دہلی میں دن عید اور رات شب برات ہونے لگی لیکن غزنوی

سلطان بلبش از پیش جنگ کی تیاریوں میں مشغول رہا۔

دو سال بعد، غوری اور پرتھی راج کے مابین دوسری لڑائی ۱۱۹۳ء میں دریائے سرسوتی کے کنارے اسی مقام پر ہوئی۔ اب کے رائے پتھورا گرفتار ہؤا اور پھر پتا نہیں اس کا کیا حشر ہؤا۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم غالب

قتل و غارتگری دستورِ قدیم کے مطابق ضرور ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد ہندوستان کی دارالسلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ غوری نے قطب الدین ایبک کو جو اسکا ترکی غلام اور بڑا معتمد تھا اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور خود وطن کو واپس ہوگیا یعنی ۱۱۹۳ء کے بعد دہلی پر مسلمانوں کی حکومت ہوئی۔

قطب الدین ایبک نے بستے شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ وہ مقام جہاں اب قطب صاحب کی لاٹھ واقع ہے وہی اس کا دارالسلطنت تھا۔ اس عہد سے دہلی کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہؤا۔ گو ایبک بحثیت نائب السلطنت کے پہلے بھی حکومت کرتا تھا لیکن سلطان محمد سام معزالدین المعروف شہاب الدین محمد غوری کی وفات کے بعد دہلی کے تخت پر اپنے نام سے حکومت کرنے لگا۔ اس کا یہ زمانہ ۱۲۰۶ء سے ۱۲۱۰ء تک ہے قطب الدین ایبک پہلا مسلمان ہے جو دہلی میں مستقل صاحب تخت و تاج ہؤا۔ بڑا سخی داتا تھا۔ اور اس لئے

لک بخش مشہور تھا۔ اس نے ابتدائے عمر میں مختلف زبانوں اور علوم کی تعلیم نیشاپور کے جلیل القدر جامع میں حاصل کی تھی۔ ارباب کمال کا بڑا قدر دان تھا۔

اس نے اپنی نیابت کے زمانے میں ہی کسی وقت ۹۸-۱۱۹۳ء کے درمیان ایک عالیشان مسجد "قوت الاسلام" اور قطب مینار کی بنا ڈالی۔ ان دونوں کی تکمیل سلطان شمس الدین التمش، اس کے داماد نے بعد میں کی۔ لال کوٹ کے اندر ایک قصرِ سفید بھی اس نے بنوایا تھا۔ مگر اب اس کا پتہ نہیں۔

مسجد قوت الاسلام پرتھی راج کے منادر کے محلِ وقوع پر انہی کے ردّو بدل سے تعمیر کی گئی۔ اب اس کے بھی کھنڈر پڑے ہوئے ہیں۔ گو بعد میں بھی کئی بار اس کی مرمت کی گئی۔ مگر اب صرف آثار باقی ہیں۔

حرم پویاں درے را مے پرستند   فقیہاں دفترے را مے پرستند
ازاں دعویٰ الشیخ و برہمن ماند   کہ ہر یک داورے را مے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے را مے پرستند   (عرفی)

قطب مینار اس مسجد کا ماذنہ تھا۔ مسجد کی شان کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ اب بھی ٹوٹی پھوٹی حالت میں جو محرابیں کھڑی ہیں۔ ان میں

لوہے کی لاٹھ سے ملحقہ درمیانی بڑی محراب کی اونچائی ۴۳ فٹ ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ قطب مینار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی یادگار میں بنایا گیا۔ مزار شریف قریب ہی واقع ہے۔ آپ پہلے مسلمان فاتحین کے ساتھ اُدش سے ہندوستان آئے تھے۔ دہلی میں کوئی پچاس سال تک رہے۔ وصال التمش کے عہد میں ۱۲۳۵ء میں ہوا، جس نے خود جنازے کی رسوم ادا کیں۔ اس درگاہ میں شاہ عالم مغل کے وزیر سلطنت ضابطہ خاں رہیلے اور اورنگ زیب کے وقائع نگار (تاریخ نویس) کی قبر کے علاوہ اب بہت سے مغل شہزادوں کی قبریں ہیں۔ بہادر شاہ اول، شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی، شہزادہ ولیعہد مرزا فخر الدین۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ثانی کے لئے بھی ایک جگہ متعین کر دی گئی تھی۔ مگر جہاں کی مٹی تھی وہیں جا کر رہی۔ اس کا مزار رنگون میں ہے۔

قطب مینار پانچ منزلہ ستون ہے جس کی اونچائی ۲۵۰ فٹ ہے نیچے کی چار منزلوں کے اوپر باہر نکلا ہوا کٹھرا ہے جس کے اوپر مینار کے گرد گھوم سکتے ہیں۔ قطر جڑ میں ۴۷ فٹ اور چوٹی پر ۹ فٹ ہے۔ اس کے اندر چکر کھاتی ہوئی سیڑھیاں ہیں۔ جن کی تعداد چوٹی تک ۳۷۸ ہے قطب مینار دنیا میں دوسرے درجے کا اونچا مینار ہے۔ سب سے نیچے کی منزل میں قطب الدین ایبک اور محمد غوری کے نام کھدے ہوئے ہیں۔ اوپر کے

تین درجوں میں التمش کا نام ہے۔ ممکن ہے قطب مینار فتح کی خوشی میں بطور یادگار بنایا گیا ہو۔ مینار پہ کندہ کئے ہوئے چند الفاظ اور شاعر امیر خسرو کے چند اشعار سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ یہ مسجد کا مینار تھا۔ اور اس پر مؤذن چڑھ کر اذان دیا کرتا تھا۔ لیکن ایک تعمیر سے دونوں مطلب حل ہو سکتے ہیں۔ قطب مینار اپنی قسم کا دنیا میں سب سے زیادہ خوشنما مینار ہے۔ نقش و نگار اور بناوٹ کی شاعری کے لحاظ سے گوٹو کے مینار کمپے نائل سے بھی بہتر ہے جو اٹلی میں واقع اور اس سے کچھ اونچا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ مقام دنیا کا انجام یا کونا قرار دیا گیا اور قطب کہلایا۔ اسی رعایت سے اس مینار کا نام قطب مینار مشہور ہوا۔ اس کے گرد دو میل کے حلقے میں جو پرانی عمارتیں موجود ہیں ان کی تاریخ اور اہمیت کا بیان محال ہے۔

قطب صاحب کی لاٹھ انگشتِ حیرت کی طرح کھڑی زمانے کی نیرنگیاں دیکھتی رہی۔ اس کی بعد میں کئی دفعہ مرمت بھی ہوئی۔ ایک شدید زلزلے میں اوپر کی ایک منزل اور چوٹی کی چھتری گر چکی ہے۔ اس نے فاتح مسلمانوں کا اولین زمانہ دیکھا۔ محمدؐ بن تغلق کے قتل اور سخاوت، تیمور کا قتلِ عام۔ کئی شاہی خاندان اس کے سامنے بنے اور بگڑے مغل بادشاہوں کے ہنگامے اور فتح و نصرت کے کارنامے۔ محمد شاہ کی رنگ رلیاں۔ انگریزی دور میں شیطان کے ہمشکل، سرمنہ کالے ریل کے انجن دیکھنا

بھی اس کی قسمت میں تھا۔ اب اس کے سائے میں انگریزی طرز کی چائے کی دعوتیں اور تفریح کی مجلسیں موسم سرما میں ہر شام ہوتی ہیں کیا کیا اس کی آنکھوں کے سامنے گذرا۔ دم بخود ہے تکلم پہ آئے تو خدا جانے کیا غضب ہو۔ اسی کا جگر ہے کہ رازوں کا سمندر سینے میں موجود ہے اور پھر کھڑی ہے۔

وہ خاندان جس کا بانی قطب الدین ایبک ہوا خاندانِ غلاماں کہلاتا ہے۔ ان کو پٹھان کہا جاتا ہے مگر یہ لوگ ترک تھے۔ اس میں ایک ملکہ اور نو بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ عرصۂ سلطنت کل ۸۴ سال یعنی ۱۲۰۵ء سے ۱۲۹۰ء تک ہے۔

قطب الدین ایبک لاہور میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر مرا اب وہ لاہور کے ایک چھوٹے سے کوچے میں انارکلی بازار کے قریب آخری نیند سو رہا ہے۔ اس کی جاہ و حشمت کی آخری نشانی، جس کو بادشاہ کی قبر کہنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا مجسم نقشہ ہے۔ لحد ایک مکان کے اندر واقع ہے تعویذ نہایت سادہ موجود زمانے کا خشتی بنا ہوا ہے۔ صاحبِ خانہ نے ازرہِ کرم اس کوٹھڑی میں باہر کی دیوار نہیں بنائی۔ جس کے سبب گلی کی طرف کا پہلو کھلا ہوا ہے اوپر چھت اور رہائشی مکان ہے۔ ہندوستان کا بادشاہ۔ پہلا مسلمان جس نے

جنّت نشان ہندوستان کا تاج سر پر رکھا اور صاحب تخت ہونے کا فخر حاصل کیا۔ بہار، کالنجر کا فاتح جس نے بنگالے تک بینظیر فتوحات کا سلسلہ باندھ دیا۔ ایک بے عدیل مسجد اور مینار بنایا، لاکھوں کو مالا مال کر دیا۔ اور لکھ داتا کہلایا۔ مگر خود دو گز زمین کے لئے محتاج ہے۔ واہ رے دنیا تیری خود غرضی۔

قطب الدین کے بعد اس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا۔ بالکل آرام طلب تھا۔ بھولے بادشاہ عیش و نشاط میں مشغول ہو گئے۔ دارِ فانی میں عیش کہاں، دنیا مزدوری کی جگہ ہے۔ کامیاب سلطان وہی ہے۔ جو شہنشاہی میں فقیری کرے۔ اس کو قطب الدین کے غلام اور داماد شمس الدین التمش نے ۱۲۱۱ء میں قتل کیا۔ اور خود تخت پر بیٹھا۔ التمش اور التتمش ایک ہی نام ہے۔ اس کے عہد میں چنگیز خاں کی ماتحتی میں مغلوں کے ٹڈی دل نے پنجاب پر بے پناہ حملہ کیا، لیکن خود ہی مغرب کی طرف سے جلد واپس پھر گئے۔ آیندہ دو سال کے عرصہ تک یہ خدا کی لعنت ہندوستان کے سر پر سوار رہی ۱۲۲۹ء میں بغداد کے خلیفہ نے التمش کے دربار میں سفیر بھیجا اور اسے مطلق العنان بادشاہ تسلیم کیا۔ التمش نے مقبرۂ سلطان غازی الدین ملک پور میں بنوایا جو قطب مینار کے شمال مغرب میں تین میل پر واقع ہے۔ التمش کا بیٹا ابو الفتح محمدؐ نامی تھا۔ بنگال میں ۱۲۲۹ء

میں مرا۔ چونکہ مقبرہ زمین کے نیچے ہے اس لئے لوگوں نے "سلطان غاری" مشہور کر دیا غالباً اس کے اوپر دوسری منزل بھی تھی جو گر چکی ہے۔ اس کے قریب رکن الدین فیروز اور معز الدین بہرام شاہ کی قبریں ہیں جو التمش کے بیٹے اور اس کے جانشین تھے۔

التمش نے مسجد قوت الاسلام کی تکمیل کی، اپنا مقبرہ خود بنوایا۔ جو قطب مینار کے بالکل قریب واقع ہے۔ التمش کا مقبرہ گو ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہے مگر قدیم صنعت گری کا بیش بہا نمونہ ہے پتھروں میں حرف اس طرح تراشے ہیں اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں کہ گویا کاریگروں کے ہاتھ میں پتھر موم ہو گیا ہو گا۔ ہندوستان میں یہ قبر سب سے پرانی قبروں میں شامل کی جاتی ہے اور یقینی طور پر اس صنعت کاری کی تو سب سے پرانی قبر ہے باہر سے اسکی دیواریں سادہ ہیں، موٹائی ساڑھے سات فٹ ہے۔

اسکے انتقال کے بعد رکن الدین فیروز اول ۱۲۳۵ء میں تخت پر بیٹھا جس کا مدفن ملک پور میں ہے ۱۲۳۶ء میں امرا نے التمش کی بیٹی "رضیہ سلطان" کو تخت پر بٹھایا۔ مگر وہ صرف ساڑھے تین سال کے بعد اپنے بھائی معز الدین بہرام شاہ کے ہاتھوں قید ہوئی۔ سلطانہ رضیہ کا مقبرہ شاہجہان آباد میں ترکمان دروازے کے اندر محلہ بلبل خانہ میں واقع ہے۔ اور رجی سجی کی درگاہ کہلاتا ہے۔ اس کو بہرام شاہ نے ۱۲۴۰ء میں بنوایا تھا۔

حیرت ہوتی ہے کہ دارالسلطنت تو لال کوٹ ہیں اور رضیہ کا مقبرہ ۵ میل کے فاصلے پر بنایا جائے۔ شاید کچھ خاص وجوہ ہونگی۔ یہ مقبرہ دریائے جمنا کے کنارے تعمیر کیا گیا تھا۔ مگر اب دریا یہاں سے بہت دور ہٹ گیا ہے رضیہ سلطانہ عربی خوب جانتی تھی۔ بڑی عقیلہ اور بہادر عورت تھی لائق باپ نے جوہر کو پہچان کر بیٹی کی تربیت شہزادوں کی طرح کی تھی اور خود کہا کرتا تھا کہ میری اولاد میں سے تخت و تاج کی اہلیت صرف رضیہ ہی رکھتی ہے۔ مردوں کا لباس پہنتی، گھوڑے پر شکار کھیلتی اور بلا نقاب دربار کیا کرتی تھی۔ لوگوں نے اس کو سلطان کا لقب دیا تھا۔ مرد اس کی شجاعت کا لوہا مانتے تھے۔ حسن خدا داد کی مالک تھی ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں غالبؔ

معزالدین نے رکن الدین یعنی فیروز اول کا مقبرہ ملک پور میں بنوایا التمش کے پوتے علاء الدین مسعود نے جو بہرام شاہ کو معزول کر کے تخت پر بیٹھا بہرام شاہ کا مقبرہ ۱۲۴۲ء میں ملک پور میں بنایا۔ سلطان مسعود نے پہلے حکمران کو قتل کر کے سلطنت تو حاصل کر لی مگر حکمرانی کی قابلیت نہیں رکھتا تھا منغلوں نے حملہ کیا اور لاہور تک بڑھ آئے تنظیم و ترتیب کیطرف اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ آخر ۱۲۴۶ء میں تخت سے اتار دیا گیا۔

التمش کا بیٹا ناصر الدین محمود تخت کا مالک بنا۔ مغلوں نے پھر حملہ کیا۔ مگر پسپا کر دیئے گئے۔ اس کا ترک سپہ سالار اور خسر الغ خاں بڑا معتمد اور امورِ سلطنت میں بڑا دخیل تھا۔ یہ وہی شخص ہے جو بعد میں غیاث الدین بلبن مشہور ہوا۔ محمود کے عہد میں اس نے ملک میں امن قائم رکھا۔

ناصر الدین محمود نے بیس سال حکومت کی۔ علم کا متجسس اور اہل علم کا مداح تھا۔ تمام عمر کتابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ شاہی خزانے کا ایک درم بھی اپنی ذات پر صرف نہ کیا۔ بہت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ملکہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی تھی۔ ایک محل کلوکھڑی کے قریب بنایا۔ اسکے جانشینوں نے اس میں اضافے کئے غالباً چھوٹا سا تھا۔ اب اس کا کوئی نشان نہیں چنگیز خاں کے پوتے نے اس زمانے میں بغداد فتح کیا، ایک سفیر محمود کے دربار میں بھی بھیجا۔ اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس کے دربار میں شیخ شکر گنج، شیخ بہاء الدین شیخ بدالدین، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جیسے روشندل صاحب دماغ اہل کمال موجود تھے۔

داماد کی وفات کے بعد غیاث الدین بلبن ۱۲۶۵ء میں تخت پر متمکن ہوا۔

بلبن کو مغلوں نے غلام بنا کر ہندوستان میں بیچا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ کہ بلبن بڑا قبیح منظر انسان تھا۔ سلطان التمش کے دربار میں جب غلام پیش کئے گئے تو اس نے بلبن کو خریدنا پسند نہ کیا۔ اس پہ بلبن نے پوچھا کہ حضور

نے یہ تمام سودا کس کے لئے کیا ہے۔ جواب ملا" بلاشک اپنے لئے" بلبن نے عرض کی " تو ایک سودا راہ مولا بھی سہی" بادشاہ نے مسکرا کر اسے بھی صف میں شامل کر دیا۔ اس نے محنت ہوشیاری اور عقلمندی سے سپہ سالار اور وزارت کا عہدہ حاصل کیا۔ شکار کا بڑا شائق تھا۔ اس نے مغلوں کو ہمیشہ شکست دی مگر انہوں نے بھی ہندوستان کا پیچھا نہ چھوڑا۔

اس زمانے سے قبل تورانی نسل کے سرداروں نے ایشیائے کوچک کی صحراؤں سے آکر ہندوستان پر حملے کئے تھے۔ تیرھویں صدی کے آخری حصے میں نئے حملہ آوروں سے مقابلہ کی ضرورت ہوئی۔ یعنی منگولین نسل کے قبائل۔ بابر بھی انہیں میں سے تھا ان مغلوں کے خونخوار ٹڈی دل جاہلوں نے عالم میں ہلچل مچادی۔ انہوں نے تمام وسطی اور غربی ایشیا کو زیرو زبر کر دیا پرانی تہذیب کو مٹا دیا۔ اور علم و فضل کے دشمن ثابت ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ پندرہ بادشاہ اور شہزادے مغلوں کے ڈر کے مارے دہلی میں آکر پناہ گزیں ہوئے۔ اہلِ کمال و صاحبِ معارف کے لئے بھی دہلی اُس وقت جائے پناہ تھی۔ بڑا بہادر متین بارعب جابر بادشاہ تھا۔ آخر بلبن کا بیٹا مغلوں کے خلاف جنگ میں کام آیا۔ اور اس کے غم میں بلبن ۱۲۸۶ء میں دنیا سے چل بسا۔

غیاث الدین نے لال کوٹ میں "لعل محل" بنوایا تھا۔ قلعہ مرزغن یا

"غیاث پور" جو حضرت نظام الدین صاحب اولیا کی درگاہ کے مقام پر واقع ہے، اسی بادشاہ کا بسایا ہُوا ہے۔

جب محمد مغلوں کے خلاف جنگ میں کام آیا تو حضرت خسروؒ نے ایک دلسوز اور طویل مرثیہ لکھا۔ اس بادشاہ نے اپنا مقبرہ خود بنوایا۔ جو قطب میں جمالی مسجد کے قریب خستہ حالت میں پڑا ہے۔

یہ بادشاہ طوطئ ہند ابوالحسن المعروف حضرت امیر خسرو دہلوی کا بڑا قدردان تھا۔ خسرو دہلوی نہایت ذکی اور ہمہ گیر طبیعت کا مالک تھا ہندوستان کے فارسی گو شعراء میں بہت ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ سلطان کا بیٹا محمود خسرو کا شاگرد تھا۔

مغلوں کی آفت کا کھٹکا تو بہتے ہوئے ناسور کی طرح شمالی سرحد پر ہر وقت لگا رہتا تھا۔ مصلحت یہی تھی کہ ایک لشکر جرار سرحد پر پیکار کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ سلطان کا بیٹا محمد جو اس تمام شمالی علاقے کا حاکم تھا۔ اس فوج کی کمان کرتا تھا۔ پایہ تخت ملتان کا قدیم شہر تھا۔

جب مغلوں کے خلاف ایک معرکے میں محمد میدان جنگ میں کام آیا تو خسرو نے ایک طویل اور پُر سوز مرثیہ لکھا۔ اس کے ۱۲۸ اشعار کو گیارہ بندوں میں ختم کیا گیا ہے یہ ترکیب بند پنجاب یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ

کے فارسی کورس مرتبہ ۱۹۲۶ء میں شامل ہے۔ پہلے تو کچھ واقعات اور جنگ کا حال بیان کیا ہے۔ پھر شہادت کا بیان ہے۔ دیکھئے ایک بند میں کس زور سے نوحہ وبکا کا ذکر ہے۔

بس کہ اندر عہد او ماہی و مرغ آسودہ بود ماہیاں در آب و مرغاں در ہوا گریستند
آسماں ہا باہزاراں دیدہ بر اہل زمیں ہمچو بارانِ بہاری بر گیا بگریستند
شبنمی کز آسماں ہر صبح می ریزد بخاک اشک انجم داں کہ از اوجِ سما بگریستند
خلقِ ملتاں مرد و زن نوحہ کناں مو کناں کو بکو و سو بسو و جا بجا بگریستند

جمعہ بود و سلخ ذی حجہ کہ بود آں کارزار
آخرِ ہشتاد و سہ آغازِ ہشتاد و چہار

اس مرثیے کا آخری شعر ہے۔ جو بلبن کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے۔

چوں محمد رفت شاہ را عاقبت محمود باد
کیقبادش اسعد و کیخسروش مسعود باد

سلطان کا بیٹا محمد جو ہر طرح سے وارثِ تخت ہونے کے قابل تھا۔ اب ایسی دنیا میں رہتا تھا جہاں خواجہ و بندہ برابر ہیں وہاں تو صرف ایک احکم الحاکمین ہے۔ کسی دوسرے بادشاہ کی ضرورت

ہی نہیں۔ اب بغرا خاں محمود کا سترہ سالہ جوان بیٹا کیقباد سلطان بنا۔ بغرا خاں بلبن کا دوسرا بیٹا تھا۔ باپ کی حیات میں وہ صوبۂ بنگال تھا۔ اور اب بیٹے کے عہد میں بھی وہ صوبۂ بنگال ہی رہا۔

معز الدین کیقباد ۱۲۸۷ء سے ۱۲۹۰ء تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ اس نے ہمایوں کے مقبرے کے قریب کلوکھڑی کے مقام پہ ایک محل بنوایا اور اس میں وہ تمام سامان جمع کئے جو عیش و نشاط میں ممد ہو سکتے تھے سلطنت کھو بیٹھا، خاندان کا نام غارت کیا۔

پسرِ نوح با بداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد

کیقباد کا والد بنگال کا حاکم تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے ماتحت ہونا پسند کیا۔ اس لئے خوابِ گراں سے بیٹے کو بیدار کرنے کی کوشش کی مگر اسے فرصت کہاں تھی۔ کلوکھڑی محل کا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ یہ اوکھلے اور ہمایوں کے مقبرے کے درمیان واقع تھا (نقشہ ملاحظہ ہو) اس مقام پر ایک چھوٹی سی بستی اب موجود ہے جسے کلوکھڑی کہتے ہیں۔ امور سلطنت اس محل میں انجام پاتے تھے لیکن یہاں پہ مستقل پایہ تخت نہ ہؤا اور لال کوٹ کی شان وہی رہی۔ اسطرح دہلی کے خطے میں ایک نیا دار السلطنت کلوکھڑی بھی آموجود ہؤا۔

خاندانِ غلاماں کے بعد خاندانِ خلجی کا دور دورہ ہؤا۔ خلج کے ایک

سردار شائستہ خاں نے کیقباد کو قتل کیا۔ اور خود تخت پر بیٹھا۔ اس کی عمر ۷۰ سال تھی جب قصرِ سفید میں اس کی تاج پوشی ہوئی۔ شائستہ خاں نے نیا لقب اختیار کیا اور جلال الدین فیروز شاہ خلجی کہلایا۔ اس خاندان میں سلطنت ۱۲۹۰ء سے لیکر ۱۳۲۵ء تک رہی۔

یہ لوگ ترک تھے اگرچہ تربیت افغانوں کے ہاں ہوئی تھی۔ جلال الدین اکثر کلوکھڑی کے محل میں رہا کرتا تھا۔ وہاں اس نے ایک "سبز محل" بنوایا اور موجودہ عمارات میں اضافے کیئے۔ اس کے امراء نے بھی گردو نواح میں محلات بنوائے جو تمام خاک ہو چکے ہیں۔ جلال الدین کے عہد میں لٹیرے بہت ہو گئے تھے مغلوں نے بھی بڑے زوروں میں حملہ کیا مگر دونوں کا قرار واقعی انسداد کیا گیا۔ اس کے عہد میں علاء الدین نے مملکت میں بہت سے حصوں کا اضافہ کیا۔ اس زمانے میں سخت قحط پڑا۔ بہت لوگ اس عذاب سے رہائی پانے کی خاطر جمنا میں ڈوب مرے۔ اس کے بھتیجے اور داماد علاء الدین نے محسن اور مہربان چچا کو دریائے گنگا میں ایک کشتی کے اندر دھوکے سے قتل کیا۔

اسے عیار پایا یار سمجھے۔ ذوق ہم جس کو
جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا۔ وہ عدو نکلا
ذوق

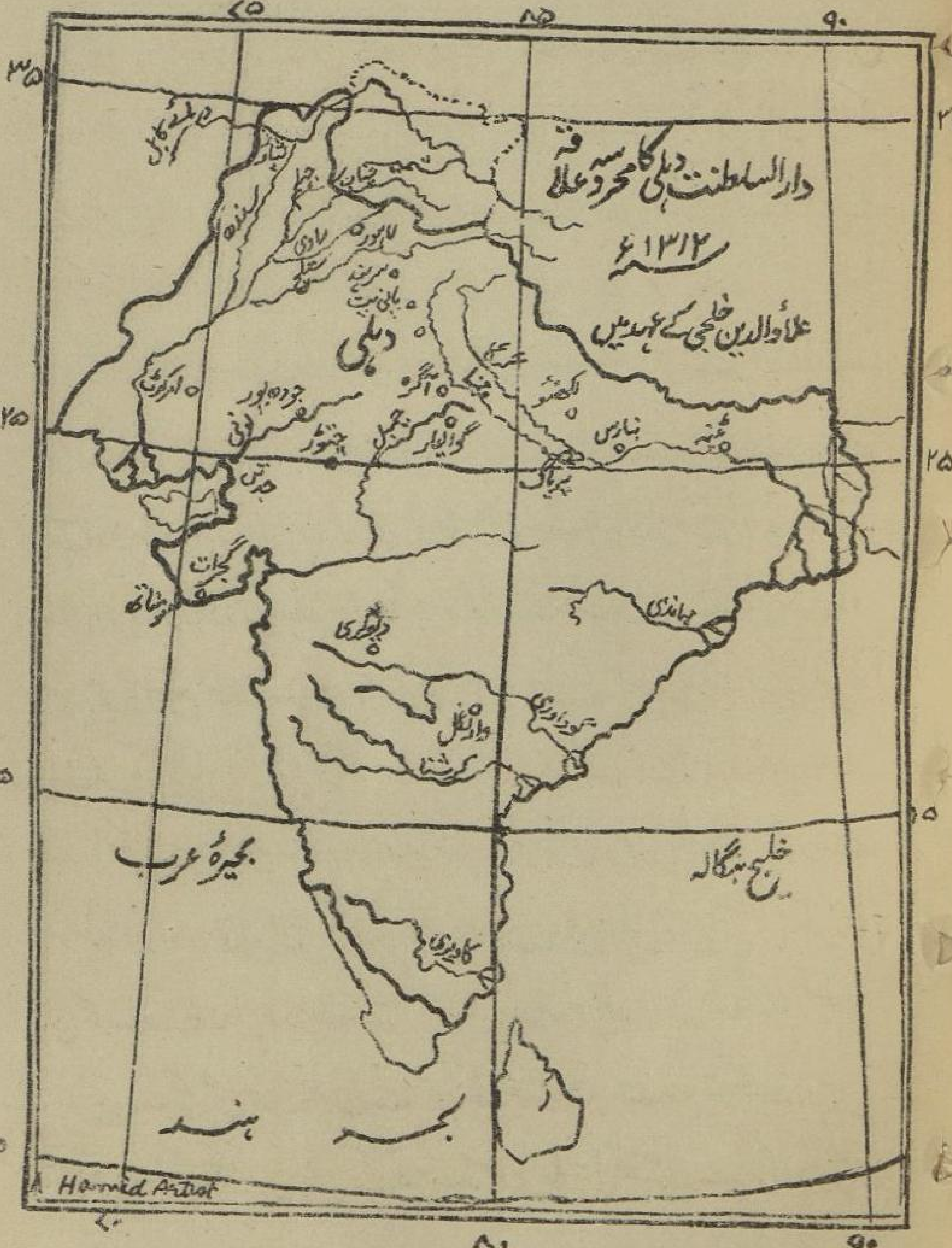
اس کے مقبرے کا ذکر فیروز شاہ نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ اب

اس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ کمسن رکن الدین ابراہیم شاہ جلال الدین کا بیٹا دہلی کے تخت پر چار مہینے تک قابض رہا۔ اس کی ماں نے کلوکھڑی کے سبز محل میں اس کی تاج پوشی کردی تھی۔ علاء الدین نے جب وہ دہلی پہنچا ایک معرکے کے بعد اسے بھی قتل کرڈالا۔ یہ لڑائی شہر کی فصیلوں کے نیچے ہوئی۔ اس کی تخت نشینی کا جلوس بڑے تزک و احتشام سے بلبن کے "کوشک لعل" میں منعقد ہوا۔

علاء الدین محمد ثانی ۱۲۹۵ء میں تخت پر بیٹھا اور اس نے ۱۳۱۵ء تک حکومت کی۔ جتنے بادشاہ دہلی کے تخت پر اس سے پہلے متمکن ہوئے یہ ان سب سے دولت رعب اور سلطنت کے لحاظ سے بڑھا ہوا تھا (نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۷) اس بادشاہ نے ایک حوض خاص بنوایا جو قطب مینار کے شمال میں دو میل پر واقع ہے۔ اور حوض علائی کہلاتا ہے۔ قطب مینار کے نمونے کا ایک اور مینار بنانا شروع کیا جو علاء الدین کا مینار کہلاتا ہے۔ اور قطب مینار کے بالکل متصل واقع ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ اس کی اونچائی قطب مینار سے دوچند ہو اور اس لئے اس کی بنیاد بھی زیادہ قطر کی رکھی گئی تھی۔ مگر بانی کی عمر نے وفا نہ کی اور مینار نامکمل رہ گیا۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ایک نہایت شاندار سنگ سرخ کا دروازہ بنوایا جو کہ قطب کے ساتھ واقع ہے


دار السلطنت دہلی کا محروسہ علاقہ
۱۳۱۲ء
علاؤالدین خلجی کے عہد میں
دہلی
لاہور
سرہند
پانی پت
آگرہ
گوالیار
چنبل
چتوڑ
جودھپور
لکھنؤ
بنارس
پٹنہ
پریاگ
گجرات
سومناتھ
دیوگری
ورنگل
گوداوری
کرشنا
کاویری
مہاندی
سندھ
جہلم
چناب
راوی
ستلج
امرکوٹ
بحیرۂ عرب
خلیج بنگالہ
بحر ہند
A. Hamid Artist

اور علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ یہ اصل میں مسجد قوت الاسلام کا ایک طرف کا دروازہ تھا۔

علاء الدین وہی ہے جس نے کملا دیوی سے شادی کی۔ برا حال تھا۔ سراب ہوس خرمن سوز اور اطمینان رہا ہوا کرتی ہے ؎

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں!
خیر ہے مومن تمہیں کیا ہوگا
مومن

رانی پدمنی پر قابو پانے کی تمنا میں مارا مارا پھرا۔ ایک لغزش سے اپنی شہرت برباد کرلی۔ اس کا لشکر بہت بھاری تھا۔ اس نے سلطنت کو وسیع کیا۔ جہاں کہیں لشکر کشی کی، فتح نے آن کر سلام کیا۔ اس نے ۲۹ لڑائیاں لڑیں اور تمام میں کامیاب رہا۔ اس کے جرنیل ملک کافور نے مغرب میں اور تغلق نے شمال میں بہت فتوحات کیں، نام آقا کا چلتا تھا۔ مگر افسوس علاء الدین نفس پہ قابو نہ پا سکا ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
غالب

متحکم الخت کوش اور امور سلطنت میں قابل بادشاہ تھا۔ اس عہد کے دستور کے مطابق بے رحم بھی تھا۔ مغلوں کے روز کے جھگڑوں سے زمانہ تکلیف میں گذارا۔ مغل پورہ ایک گاؤں دہلی کے قریب مغلوں کی بستی تھی۔ یہ لوگ فوج

میں سپاہی تھے۔ انہوں نے گجرات کے ایک حملے میں نافرمانی کی۔ علاءالدین دہلی میں تھا۔ اس نے تمام مغلپورے کے بچے عورتوں کو تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حرکت پر ہندوستان کی حدود کے باہر مغل چراغ پا ہو گئے۔ اور انہوں نے ٹڈی دل لشکر سے حملہ کی تیاریاں کیں ۱۲۹۷ء میں مغلوں کا ایک بڑا لشکر دہلی کی فصیلوں تک آ گیا۔ علاءالدین نے ان کو شکست دی اور واپس بھگا یا ۱۳۰۳ء میں مغل پھر دہلی میں گھس آئے۔ خدا کی غنائت خود بخود پھر گئے۔ بادشاہ نے اس کے بعد ان کی طرف بہت توجہ دی اور وہ ہمیشہ سرحد کے قریب ہی مغلوں کے لشکر پہ غالب آنے میں کامیاب رہا۔ ۱۳۰۵ء و ۱۳۰۶ء میں مغلوں نے پھر حملہ کیا مگر تغلق نے انہیں نیچا دکھایا۔ مغلوں کی کھوپریوں سے کئی مینار بنائے گئے۔ ان کی بیخ کنی کرنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی۔

علاءالدین نے جیسلمیر، رنتھمبور، چتوڑ وغیرہ کے مشہور قلعے فتح کئے مغلوں کے خوف سے علاءالدین نے لال کوٹ کی مرمت کرائی اور ایک نئے شہر "سیری" کی ۱۳۰۳ء میں بنا ڈالی جو لال کوٹ سے ملحق ہے۔ نقشہ ملاحظہ ہو (صفحہ اول) مستحکم قلعہ اور اس کے اندر محل بنوائے۔ انکی تکمیل بعد میں قطب الدین خلجی نے کی۔ اس میں ایک عالیشان محل بنوایا جس کے ہزار کھمبے تھے۔ اسکا نام "قصر ہزار ستون" رکھا۔ اس مقام پر اب شاہ پور نامی گاؤں بستا ہے تمو

نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ شہر سیری کے سات دروازے تھے جن میں سے تین لال کوٹ کی طرف کھلتے تھے۔ سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ دیواریں ۱۷ فٹ چوڑی تھیں۔ اب حوض خاص اور متعلقہ عمارتیں باقی ہیں جن کا بہت سا حصہ شکستہ حالت میں ہے۔ یہ شہر کھنڈرات کی صورت میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ صرف فصیلوں کے نشان موجود ہیں۔ اس نے مسجد قوت الاسلام کی توسیع کی اور پرانے قلعے کی فصیل مرمت کرائی۔ سیری میں ایک مسجد بنانی شروع کی مگر وہ بھی نامکمل رہ گئی۔ علاء الدین کا مقبرہ قطب الدین مبارک اوّل خلجی نے ۱۳۱۵ء میں بنوایا۔ یہ مزار اب شکستہ حالت میں علائی دروازہ کے بائیں طرف واقع ہے۔

اب دار السلطنت دہلی کو تیسری جگہ مستقل طور پر منتقل کیا گیا۔ پرانا قلعہ کورو پانڈو کے زمانے میں۔ لال کوٹ اننگ پال کے عہد سے۔ کلوکھڑی لبی مگر بہت وقعت نہ رکھتی تھی۔ اب تیسرے مقام پر سیری دار الحکومت بنی۔ جہاں بادشاہ رہے گا۔ تمام سلطنت کے کاروبار ہونگے وہی دار السلطنت کہلائیگا اب سیری کو یہ شرف حاصل ہوا۔ آج سیری اور لال کوٹ کے تمام محل مٹ کر خاک ہو گئے ہیں۔

علاء الدین شاید کافور کے ایما سے غالباً زہر سے جان بحق ہوا۔ ملک کافور نے علاء الدین کے کمسن بیٹے شہاب الدین عمر کو ۱۳۱۵ء میں تخت

پر بٹھایا اور خود اس کا سرپرست بنا مگر ظلم و تعدی کے سبب ملک کافور ۳۵ دن کے بعد قتل ہؤا۔ فیروز شاہ نے اس کی قبر کی مرمت کرائی تھی شہاب الدین عمر کے بھائی قطب الدین مبارک اول نے صرف تین مہینے کے بعد اس کو معزول کرنے کے بعد قتل کرا دیا ؎

شربتِ سلطنت و جاہِ جہاں شیریں است   کہ شہاں از پئے او خونِ برادر ریزند
خونِ آزردہ دلاں راز پئے ملک مریز   کہ ترا نیز ہماں جرعہ بساغر ریزند

مبارک شاہ بڑا عیاش تھا۔ چند روز میں یہ بالکل واجد علی شاہ بن گئے۔ اس کا منہ چڑھا ایک نومسلم خسرو خاں تھا۔ مبارک کا وہی حشر ہؤا جو اس نے بھائی کا کیا تھا۔ یعنی خسرو خاں کے ہاتھ سے ۱۳۲۰ء میں قتل ہؤا۔ فیروز شاہ نے اس کی قبر کی بھی مرمت کرائی تھی مگر اب اس کا پتہ نہیں چلتا۔ خسرو خاں تخت پر بیٹھا۔ اس نے بہت برے اخلاق و اطوار کا اظہار کیا۔ تمام امرا ناراض ہو گئے۔ دنیا میں دوام کسی چیز کو نہیں۔ انسان عاقبت پہ نگاہ کرے تو ہوس کا نام نہ لے۔ نیا بادشاہ ناصر الدین ملک خسرو کے لقب سے تخت نشین ہؤا۔ صوبہ پنجاب کے حاکم غازی بیگ تغلق نے اسی سال حملہ کیا حوض خاص کے قریب لشکر مقابل ہوئے۔ خسرو خاں بھاگا۔ دوسرے دن ایک قبر میں چھپا ہؤا پکڑا گیا اور قتل ہؤا۔

اب چونکہ خلجی شاہی خاندان کا کوئی فرزند باقی نہ رہا۔ لوگوں نے تغلق کو

بادشاہ بنایا۔ یہ غلام تھا۔ اس کا اصلی وطن خراساں تھا۔ علاء الدین کے عہد میں دہلی آیا۔ بعد میں دیپال پور اور پنجاب کا حاکم مقرر ہوا۔ ایک دن وہ تھا کہ علاء الدین کے نام کا ڈنکہ تمام ہندوستان کی سرزمین میں بجتا تھا۔ وہ اس کا تنہا حکمران تھا۔ آج وہ دن ہے۔ کہ اس کی اولاد میں سے ایک نام لیوا بھی باقی نہیں۔ ایک فرد نہیں ملتا جسے تخت پر بٹھایا جائے تغلق نے خود اس خواہش کا اظہار کیا مگر کوئی ہو بھی۔ قانونِ قدرت ہے۔ بہار کے بعد خزاں کا دور دورہ ہوتا ہے جب جاڑا نکل جاتا ہے تو جوشِ بہار سے زخموں میں کونپلیں پتے پھول پھل نکل آتے ہیں۔ اس بوستاں کی خوشبو دور دور تک پھیلتی ہے اور ایک عالم مہک اٹھتا ہے۔ جب خزاں کا تسلط ہوتا ہے۔ پھول کلیاں تو اس کا نام سنکر مرجھا کر سرے سے غائب ہو جاتی ہیں۔ اور بادِ مخالف کے جھونکے چہرہ مدقوق کے ہمرنگ زرد پتوں کو چار گوشوں میں پریشان کر دیتے ہیں۔ جہاں وہ سڑ کر خاک میں خاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔

غازی بیگ المعروف غازی ملک نے تخت پر بیٹھ کر غیاث الدین کا لقب اختیار کیا۔ چونکہ اس کے باپ کا نام یا اس کا اپنا نام تغلق تھا۔ اسلئے بادشاہوں کا وہ سلسلہ جو اس سے شروع ہوا "خاندانِ تغلق" کہلاتا ہے۔ یہ بادشاہ قوم کے ترک تھے۔ تغلق ترکی لفظ ہے جس کے معنی پہاڑی (اسم صفت) کے ہیں۔

جو پشتو کے لفظ رہیلہ (پہاڑی علاقہ کے رہنے والے) کے مترادف ہے۔
انسانی زندگی کے لئے طعام اور لباس کے ساتھ ایک جائے رہائش کی بھی ضرورت ہے۔ ہر قوم اور ملک اپنی مرضی کے مطابق طرزِ تعمیر کی اختراع کرتا ہے۔ یہ بناوٹ پھر اس قوم یا ملک کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ جس سے اس کے تمدن تہذیب طرزِ معاشرت اور اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔

مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر عمارتوں کے بنانے کی نئی روش پیدا کی۔ ہندؤں کے عہد کی عمارات کی شکل جداگانہ تھی۔ مذہب ملک کے طبعی حالات، آب وہوا، ماحول، خیالات، طرزِ رہائش اور مال مثالہ جو اس مقام پر دستیاب ہو سکے کسی جگہ کی عمارتوں کی بناوٹ پر بڑا اثر رکھتے ہیں ہندوستان کی تیز دھوپ، روشن رنگوں اور موسم کے نمایاں تغیر وتبدل کا اثر، ضروری تھا کہ باشندوں کی ذہنیت پر ہو۔ تعمیرات میں بھی اسی مطابقت سے نمایاں اختلافات کا ہونا لازمی تھا۔ پھول پتے پھل حیوان انسان وغیرہ شکلیں پتھر میں تراشنے کے لئے بہت سے نمونے مہیا ہو سکتے تھے۔ ہندوؤں نے اس کا بہت اچھا استعمال کیا۔ مگر مسلمانوں کے لئے جانوروں کی تصاویر کے استعمال میں بعض اوقات مذہب مانع رہا۔

ہندوؤں کے کثیر التعداد دیوتاؤں کے لحاظ سے ہر ایک کے نام مختلف

منادر کی تعمیر ہوتی تھی۔ بمونہ میں پیچیدگی اور تفصیلات کا آپس میں تقابل اور اختلاف - ہر حصے پر گہرے نقش و نگار تراشے جاتے تھے - جن میں حیوانی اور انسانی شکلیں بھی موجود ہوتی تھیں - جہاں ہر حصہ الگ الگ اہمیت رکھتا ہو، ان حصوں کے ایک دوسرے سے تناسب کے ذریعہ ترتیب اور مناسب نشست سے اتحادی بناوٹ میں دل خوش کن اثر پیدا کرنا نہایت ضروری ہے - فرداً فرداً عبادت کے لئے چھوٹے چھوٹے دروازوں تنگ حجروں اور قریب بینی کے لئے باریک نقش و نگار کی ضرورت تھی - دروازہ پر ایک پیشانی کا بڑا پتھر رکھ دیا جاتا تھا جسے داسہ کہتے ہیں - اس طرح دروازہ چار پہلوؤں کا مستطیل نظر آتا تھا - مگر مسلمانوں نے آکر محراب کا استعمال کیا انہوں نے دروازوں میں نوکدار یا گول ڈاٹیں بنائیں مسجدوں کے فراخ صحن رکھے تاکہ باجماعت نماز ہو سکے مقبروں کے گرد باغ لگائے - ان کو نہروں اور فواروں سے سجایا -

مسلمان فاتحین نے ہندوستان میں آکر ہندو کاریگروں سے کام لیا انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرزِ تعمیر کو ملا کر عمارتیں بنائیں جس کے سبب خود بخود ایک نئی وضع بن گئی - پھر ان میں بتدریج تبدیلی ہوتی گئی اور مسلمانوں نے بعد میں عمارات اپنے نقشے کے مطابق بنوائیں - مسجد قوت الاسلام اس زمانے کی سب سے پہلی تعمیرات میں سے ہے - اس وقت مسلمانوں نے عجلت سے کام لیا خواہش یہ تھی کہ جلد از جلد عمارتیں تیار ہو جائیں - اس مصروفیت

کے ہنگامے میں انہیں اس کام کی طرف توجہ دینے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ مسجد قوت الاسلام کے عمود کسی مندر کا حصہ معلوم دیتے ہیں۔ اور بناوٹ میں موجودہ اسلامی طرز سے مختلف ہیں۔ اس ابتدائی زمانے میں جب مسلمانوں نے ابھی ہندوستان میں قدم رکھا تھا انکی طرزِ تعمیر اسی طرح کی تھی۔ انہوں نے تفصیلات کو ہندو کاریگروں کی مرضی پر چھوڑ دیا جنہوں نے اپنے قدیم دستور کے مطابق عمارت کو بنانے کی کوشش کی۔ یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ مسجد قوت الاسلام کی محرابیں صحیح ڈاٹ کہلانے کی مستحق نہیں چونکہ ان کے پتھر ہم مرکز وضع میں نہیں رکھے گئے۔ ہاں پتھروں کو ٹرھا بڑھا کر رکھنے سے نوکدار محراب کی شکل پیدا کر دی گئی ہے۔

فاتح مسلمان سپاہیوں کا گروہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ وطن سے معمار یا نقشہ کش نہیں لائے تھے۔ لیکن ان کی قابلیت اور تخیّل کی پرواز، فن تعمیرات کے سلسلے میں بہت قابلِ قدر ہے۔ ان کی ایک معیّن طرز تھی اس لئے وہ اپنے نقشے میں کبھی غلطی نہیں کرتے تھے۔ گو شروع شروع میں ہندو کاریگروں نے ہندو اور مسلمان دونوں طرزوں کو ملا کر کھچڑی بنا دی تھی مگر اسے بعد میں صاف کر دیا گیا۔

عہد مغلیہ سے پہلے کے زمانے کی عمارات کا نقشہ ساسانی۔ اور ہندوستانی ملا ہوا ہے۔ یہ بناوٹ دہلی کے خطے کے لئے مخصوص ہے۔

اس زمانے کو تین عہدوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دہلی کے آثار الصنادید فنِ تعمیرات کے لحاظ سے، زمانے کی رفتار کے ساتھ چار طبقات میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے لئے کوئی اور بہتر نام میسّر نہیں آتے اس لئے انکے نام یہ رکھے جاتے ہیں:- (۱) ابتدائی (۲) تغلق (۳) افغان (۴) مغل۔ یہ دور محض طرزِ تعمیر کی تقسیم کے نام ہیں۔ بادشاہوں کے خاندانوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ گو ان دوروں میں کوئی نمایاں حد فاصل نہیں اور اکثر اوقات ایک دور دوسرے میں تدریج جذب ہو جاتا ہے۔ تاہم دور ابتدائی خاندان غلاماں اور خلجی کی عہدِ حکومت پر مشتمل ہے۔ تغلقوں کے عہد میں ایک ہی بناوٹ کی بہت سی عمارتیں بنیں۔ اور یہ تغلقی دور کہلاتا ہے۔ دورِ افغانی میں خاندانِ سادات اور لودھیوں کا زمانہ ہے۔ پانی پت کی فتح کے بعد مغلوں کا تسلّط ہوا مگر طرزِ تعمیر میں بہت تبدیلی نہ ہوئی۔ افغان شیر شاہ سوری نے اپنی ٹھیٹھ افغانی طرز کو قائم رکھا۔ ہمایوں کے عہد سے مغلئی دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں کثیر التعداد عظیم الشان عمارات بنیں۔

ابتدائی دور میں مسلمانوں کا اوائل زمانہ تھا اور آتے ہی انہیں تعمیرات کی فکر ہوئی۔ چونکہ معمار ہندو تھے انھوں نے مسلمانوں کے نقشے کے مطابق محرابیں اور گنبد تو بنا دئیے مگر تفصیلات کو ہندوانی طرز کے نقش و نگار سے

مرصع کیا۔ اور مال مثالہ بھی اپنی مرضی کے مطابق لگایا۔ دیواروں اور چھتوں پر طغرے کم گہرے کھودے گئے۔ مسلمانوں کی سادہ اونچی محرابیں ہندوؤں کی نیچی پر از نقش و نگار غلام گردشوں سے الگ نظر آتی ہیں۔

اس کے بعد سوچ سمجھ کر بہتر نقشہ تیار کیا گیا جیسا کہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین کی مسجد (جماعت خانہ کی مسجد) اور علائی دروازے سے ظاہر ہے اس مسجد کے پانچ گنبدوں میں سے مرکزی کا قطر ۵۲ فٹ سے کم نہیں جو کہ اس عہد کا بہت بڑا گنبد ہے۔ قطب کے ساتھ علائی دروازے کا گنبد ہندوستان میں سب سے پرانا ساسانی شکل کا گنبد ہے۔ اس کی دیواروں کی نقاشی بہت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ التمش کی قبر اس عہد کی نقاشی و صنعتکاری کا بے عدیل نمونہ ہے۔ بلبن کی قبر لال کوٹ کے باہر جنوب مشرق کیطرف شہر کی فصیلوں کے اندر واقع ہے۔ التمش کی قبر کی طرح مربع عمارت ہے۔ اس سے بڑی اور پہلوؤں میں کمرے۔ مگر اب بالکل کھنڈر نظر آتی ہے۔

قطب مینار اس عہد کی ایک عظیم الشان یادگار ہے۔ اس کی شکل مخروطی ہے۔ دیواروں پر بہت عمدہ نقش و نگار اور آیات کندہ کی ہوئی ہیں۔ اس دور کے گنبدوں کی شکل ابتدائی ہے یعنی بہت نیچے چپٹے سے معلوم دیتے ہیں چھت کے ساتھ فوراً اندر کی طرف گولائی شروع کر دی

جاتی تھی اور گنبد اونچا نہیں ہونے پاتا تھا۔ شکل میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چپٹا پیالہ اوندھا رکھ دیا جائے۔ مثلاً علائی دروازے کا گنبد۔ خلجیوں کی عمارتوں میں عمارات کے مختلف حصوں کا تناسب قدرے بہتر ہو گیا تھا۔ ان کے سطحی نقش و نگار فنِ لطیف کا بیش بہا گنجینہ ہیں ؞

۶۔ تغلق آباد و عادل آباد

اب تغلق بادشاہوں کا زمانہ آیا۔ غیاث الدین تغلق اول ۱۳۲۰ء میں تخت پر بیٹھا۔ اپنے بیٹے کی ایک تدبیر سے ۱۳۲۴ء میں مارا گیا۔ اس کا مقبرہ تغلق آباد میں ہے جو اسی کے عہد میں پہلے سے بنا ہوا تھا۔ اس مقبرے میں اب تین قبریں ہیں۔ غیاث الدین، اس کی بیوی اور اس کا بیٹا محمدؐ بن تغلق ان میں استراحت کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں حضرت نظام الدین صاحب کے ہاں کی باولی حضرت نے خود بنوائی۔ غیاث الدین نے ایک نیا قلعہ پہاڑی پر بسایا "تغلق آباد" نام رکھا۔ یہ قطب سے ۵ میل کے فاصلے پر ہے (نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ) اس کے گرد مضبوط فصیل بنوائی اس میں محلات بنوائے اور خزانہ رکھا۔ تمام شاہی کاروبار وہاں منتقل کر دیا۔ تغلق آباد بڑا مستحکم اور چٹان پر بنا ہوا، پرانی طرز کا سنگین قلعہ ہے تغلق آباد وہ مقام ہے جہاں اپنے محل کے مخصوص بلند مقام سے غیاث الدین کی جنگجو آنکھیں ان میدانوں پر نگاہ ڈالتی تھیں جن کا تنہا حکمران ہونے کا اسے فخر حاصل تھا۔

اب تغلق آباد ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات کی شکل میں موجود ہے۔ سوائے

کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور گرے پڑے پتھروں کے کچھ موجود نہیں۔ البتہ جسیم پتھر کی دیواریں اب تک کھڑی ہیں۔ جن سے مضبوطی اور رعب جھلکتا ہے۔ غالباً کسی زبان کے مروجہ الفاظ اس حسرتناک وحشت اور پر شوکت ویرانی کا صحیح نقشہ نہیں کھینچ سکتے جو تغلق آباد اور عادل آباد کے بسیط و عریض دہشتناک کھنڈرات سے ہویدا ہے۔ ویرانہ کہنے سے مفہوم بالکل تشنہ رہ جاتا ہے۔ اکیلے آدمی کے لئے وہاں گھومنا خطرناک ہے۔

یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

یہ چوتھا مقام ہے جہاں پہ دہلی آباد ہوئی چونکہ ہندوستان کے دارالسلطنت کو مستقل طور پر وہاں منتقل کر دیا گیا۔

اس کی وفات کے بعد اسکے بیٹے جونا شاہ الغ خاں نے محمد بن تغلق کا لقب اختیار کیا اور ۱۳۲۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ بادشاہ بنتے ہی تغلق آباد سے دارالسلطنت منتقل کر کے لال کوٹ میں لے آیا جہاں پر اوائل سے دارالحکومت تھا اور قوت الاسلام مسجد اور قطب مینار جیسے نوادرِ روزگار موجود تھے پرانی جائے رہائش کو خیرباد کہنے کا ایک سبب، ممکن ہے یہ بھی ہو کہ وہاں پانی کی قلت اور اس کو مہیا کرنے کی دقت تھی۔ لیکن محمد تغلق کی طبیعت کو چین نہیں ہوا۔ ایک الگ مقام پر ۱۳۲۵ء میں تغلق آباد کے جنوب مشرق میں اسکے نزدیک ایک نیا قلعہ اور اس میں قصر ہزار ستون بنایا۔ چونکہ اس کا لقب عادل شاہ تھا۔

قلعے کا نام "عادل آباد" رکھا۔ اس میں اچھی خاصی آبادی ہو گئی۔ امرائے شاہی یہیں اقامت رکھتے تھے۔ یہ پانچواں مقام تھا جہاں دہلی کی آبادی کو منتقل کیا گیا۔ اپنے زمانے میں یہ بھی دارالسلطنت تھا۔ ہندوستان کا بادشاہ یہیں پر تھا امرا وزرا یہیں پر تھے۔

اس کی تخت نشینی کے پہلے سال مغلوں کا ایک بڑا لشکر شہر دہلی تک آ گیا۔ مقابلے کے لئے فوج کافی نہ تھی۔ زر و مال دیکر انہیں واپس کیا۔ مصر کے عباسی خلیفہ نے اس کے دربار میں سفیر بھیجا اور اسے مطلق العنان بادشاہ تسلیم کیا۔

سیری کا قلعہ ۱۳۰۳ء کے قریب علاء الدین خلجی نے بسایا تھا۔ ۱۳۲۶ء میں سیری اور لال کوٹ تمام کے گرد، اس بادشاہ نے فصیل بنائی غرض یہ تھی کہ غنیم کے حملوں سے حفاظت ہو سکے اور آبادی کو محفوظ کر دیا۔ مغلوں کے حملے کا خطرہ ہر وقت لگا ہوا تھا۔ اس مشترکہ فصیل کا نام "جہاں پناہ" رکھا، اس طرح شہر کا نام بھی یہی ہو گیا۔ مگر یہ نیا شہر نہ تھا۔ آبادی تو دونوں جگہ پہلے سے موجود تھی صرف حفاظت کی غرض سے تمام کے گرد ایک مستحکم شہر پناہ بنوادی۔ اس کی مغربی دیوار میں چھ دروازے تھے اور مشرقی میں سات۔

محمد بن تغلق جسے محمد تغلق بھی کہا جاتا ہے، عجیب مزاج کا آدمی تھا۔ بالکل بادشاہ مزاجِ شاہاں عجیب است گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے

خلقتے بدہند۔ عالم اور تربیت یافتہ آدمی تھا مگر اپنے وہم کے ہاتھوں بِکا ہوا دُھن کا پکّا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا دربار فاضلوں کا ملجا و ماوا بھی تھا۔ بہت ہی قابل ہستیوں کو اس نے خاک میں بھی ملایا مگر سخاوت و بخشش کے بھی دریا بہائے۔ اس کی ہوا و ہوس نے جنون کی بہت سی زندہ شکلیں اختیار کیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا تھا۔ اس کے ہاتھوں کئی بے سرو پا لغزشیں ہوئیں۔ خود عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا تھا مگر ظلم و تعدی کے سبب خونی سلطان مشہور ہوا ؎

حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ خودسری، خودستائی، خود رائی

ایک ناچیز مشتِ خاک، اللہ اس نے یہ کبریا کہاں پائی

(میر)

خدا جانے ساری عمر میں کیا کیا حرکات کی ہونگی مگر مشتے نمونہ از خروار، ملاحظہ ہو۔ ایران کی فتح کا سودا سر میں سمایا مگر آرزوئیں بار آور نہ ہوئیں۔ اس کے بعد آپ پر چین کی فتح کا جن سوار ہوا۔ بجا ہے، ہمسایوں کا پہلا حق ہوتا ہے۔ دور کیوں جائیں، اول خویشاں بعد درویشاں بخبط ہی سہی مگر یہ بھی بڑے شکی کی بات ہے کہ بھارت باسی کو غیر ملک کی فتح کا خیال تو ہوا۔ ایک گراں لشکر تیار کیا اور ایک لاکھ آدمی بھیج ہی دیئے۔ ہمالہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے اس کے دشوار گذار دروں میں سے پار جانا کوئی آسان کام نہیں ہندوستانی غریب

گرم ملک کے باشندے انہیں برف سے کیا مطلب؟ کچھ سپاہ غیر ملک میں غنیم کے ہاتھوں مری کچھ برف کی نذر ہوئی باقی رسد کی کمی کے سبب فاقوں سے مری۔ رہی سہی لوٹ کے آئی۔ سلطان نے قتل کرا دی کہ بڑے بے غیرت ہو، ناکام میرے پاس واپس آئے ہو۔

اِن فضول خرچیوں سے خزانے میں روپیہ کم ہوا تو چاندی کی بجائے تانبے کے روپے بنوائے۔ وہ ٹکسال ہی میں پڑے رہے۔ لے کون؟ اس سے رعایا کو ایذا دی۔ جب اس طرح بن نہ پڑی تو زمین پر محصول بڑھایا اور اس قدر بڑھایا کہ کسانوں نے ہل جوتنا چھوڑ دیا۔ فوج کو حکم دیکر انہیں گھیرا اور جان سے مار دیا کہ زمین کیوں نہیں بوتے۔

غرض عجیب معجونِ مرکب تھا۔ کہیں آپ دکن میں مہم فتح کرنے گئے تھے مہم فتح ہو گئی۔ اس اثنا میں دیوگری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ شہر بہت پسند آیا دیوگری نہایت عظیم الشان اور مستحکم قلعہ ہے جو پہاڑی کے اوپر واقع ہے قرب و جوار سے اس کی کرسی اونچی ہے۔ اور الگ معلوم ہوتا ہے جیسے سمندر میں جزیرہ۔ یہ سنگین گڈھ ہے جس کی ٹھوس پتھر کی تراشی ہوئی دیواریں ہر طرف ۸۰ فٹ سے ۱۰۰ فٹ تک زمین سے اوپر بلند ہیں۔ اس سے ۹ میل کے فاصلے پر الورا کی مشہور گپھائیں ہیں۔ مقام روضہ عرف خلد آباد یہاں سے ۷ میل کے فاصلے پر ہے، جہاں حضرت عالمگیر اورنگ زیب آخری

نیند سو رہے ہیں۔ جہاں پر نہ دارا شکوہ سے معرکے کی فکر، نہ دکن کی فتح کا خمار ہے۔ اللہ کا جلال قبر پہ چھایا ہؤا ہے تاریخی شہر اورنگ آباد علاقے کا صدر مقام دیوگری سے ۸ میل کے فاصلے پہ ہے۔ اب یہ تمام علاقہ نظام دکن کے ممالکِ محروسہ میں شامل ہے (دیوگری کا محل وقوع دیکھنے کے لئے نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ)

محمد تغلق نے اس شہر کو بہت پسند کیا۔ اس کا نام 'دیوگری' سے بدل کر "دولت آباد" رکھا اور حکم دیا کہ دارالسلطنت کو وہاں منتقل کر دیا جائے۔ دولت آباد کے خطے میں بھی کچھ تسخیر قلوب کا عمل پنہاں ہے۔ تاریخی لحاظ سے بھی یہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک خاص صفت یہ ہے کہ انگور اور انجیر کی کاشت دولت آباد میں بڑی خوبی سے ہو سکتی ہے۔

محمد تغلق اس وقت جہاں پناہ میں رہتا تھا جو سیری اور لال کوٹ کی مشترکہ فصیل تھی۔ پہلا حکم ۱۳۲۸ء میں ہؤا کہ دہلی سے دولت آباد چلو۔ فاصلہ مابین ۸۰۰ میل ہے منادی کر دی گئی کہ تمام پرجا دہلی چھوڑ دولت آباد میں جا بسے۔ نقل و حرکت کے لئے پختہ سڑک بنوائی گئی۔ کنوئیں کھدوائے گئے سرائیں قائم کی گئیں۔ بھلا اپنا وطن کس کو عزیز نہیں اور پھر ہندوستان کی دارالحکومت جنت نشان دہلی۔ اپنا مسکن کون چھوڑتا ہے۔ اپنے گھر سے خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو ہر ایک کو الفت ہوتی ہے۔ اسی لیت و لعل میں تھے کہ ملکی بغاوتیں شروع ہوئیں

(1) بابر



(2) شاہجہاں



(3) اورنگ زیب



(4) بہادر شاہ



مغل بادشاہوں کے سکے۔ کیفیت کے لئے سامنے کا صفحہ دیکھئے

اور راجاؤں سے جھگڑے ہوئے جن کے سبب محمد تغلق کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی۔ اور وہ کچھ عرصے کے لئے اس خیال کو بھول گیا۔

جب ملک میں چین ہوا تو ۱۳۴۰ء میں پھر امنگ اٹھی۔ اب کے احکام سلطانی پر بڑی شدومد سے عملدرآمد کیا گیا۔ ساکنین کو باہر نکال گھروں کو آگ لگادی تاکہ واپسی کا نام نہ لیں۔ تمام شہر میں فوج گشت لگاتی پھرتی تھی کہ کوئی رہ تو نہیں گیا۔ جنون سوار تھا۔ قہر درویش بر جانِ درویش تمام دولت آباد پہونچے۔ جہاں پناہ میں اُلو بولتا تھا۔ مگر دلی کے بھاگ ہندوستان کی ملکہ بننا ابد سے اس کی قسمت میں ہے۔ کوئی تدبیر سے کتنا سنبھالے مگر تقدیر سے لڑائی نہیں کی جاسکتی۔ دو سال کے بعد دکن میں بہت سخت قحط پڑا اور دو تین سال تک برابر رہا۔ امیروں نے عرضیاں گذاریں۔ بڑی مشکل سے رعایا کو اجازت ملی کہ دہلی واپس چلے جاؤ۔ اس آمدورفت میں جان ومال کا بہت نقصان ہوا آخر ۱۳۴۵ء میں دلی پھر آباد ہوئی۔

اُسکو بھولا نہ چاہیئے کہنا جائے جو صبح اور آئے شام غالب

کوئی بات نہیں پانچ سال کا تفریحی سفر یہ بھی سہی۔ تبدیل آب وہوا کی غرض سے ایک لمبی سیر ہوگئی۔ ہر بات جو نئے سرے سے پیدا کی جائے اس کی پھبن نرالی ہوتی ہے دہلی اب جو بسی تو پہلے سے زیادہ شان میں تھی۔

محمد بن تغلق کے عہد میں ساٹھ پلا بنا جو پانی روکنے کے لئے ایک

بڑے بند کا کام دیتا تھا۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کا مقبرہ اور طوطئ ہند امیر خسرو کا مقبرہ پہلے پہل تعمیر ہوئے۔ بعد میں کئی دفعہ ان مزارات میں اضافے کئے گئے یا نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ احاطے کی عمارات علاء الدین خلجی کے عہد سے شروع تھیں۔

۱۲۳۵ء ۶۳۶ھ میں حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کی ولادتِ مسعود سے اس دہرِ ناپائدار نے فخر حاصل کیا۔ آپ کا نام محمد بن احمد بن علی النجاری ہے۔ ظاہری اور باطنی تمام مراحل طے کئے۔ آپ سے بہت سی کشف و کرامات ظہور میں آئیں۔ آپ کا لنگر خاص و عام کے لئے جاری تھا۔ جس سے ہزارہا لوگوں کو روز کھانا ملتا تھا۔ اب بھی درگاہ کا فقیر کبھی بھوکا نہیں رہتا۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود سالہا سجدہ گہِ اہلِ نظر خواہد بود۔ حافظ

یہاں اہلِ نظر کو راہِ راست دکھائی دیتی ہے اور بے بصر آنکھیں حاصل کرتے ہیں۔ ہزارہا آتے ہیں اور جھولیاں مرادوں سے بھر کر لے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کے مقبروں پر زائرین گاہے ملے جاتے ہیں مگر یہاں عقیدتمندوں کا تانتا صبح سے شام تک لگا رہتا ہے۔ وہاں کی رونق دن بدن گھٹتی چلی جاتی ہے۔ مگر یہاں روز افزوں ترقی پر ہے۔ یہ بذاتِ خود کرامات ہے آپ کی زندگی کا کثیر حصہ اس مقام پر گذرا جہاں اب آپ کا مزار ہے

کلوکھڑی اس وقت بڑا پُر رونق شہر تھا اور روسا وہیں رہتے تھے۔ آپ بھی کچھ عرصہ وہاں پر جامع مسجد کے قریب رہے۔

آپ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں دہلی تشریف لائے تھے۔ اس کے بعد کیقباد تخت پر بیٹھا۔ جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، قطب الدین خلجی، خسرو خاں اور غیاث الدین تغلق، محمد ثالث بن تغلق کا زمانہ آپ نے دیکھا ۱۳۲۴ء ۷۲۵ھ میں جس سال محمد بن تغلق تخت پر بیٹھا، حضرت کا وصال ہُوا۔

مزار کے اردگرد مغل شہزادے اور خاندانِ مغلیہ کے دیگر لوگ لیٹے ہوئے ہیں۔ ایک سرخ مسجد ہے۔ جو فیروز شاہ نے بنوائی تھی۔ جامع صفات عالم متبحر حضرت امیر خسرو کا مزار بھی اسی احاطے میں ہے۔ ابتدا میں مزار شریف ایک جالی دار چار دیواری میں تھا جس پر سلطان محمد بن تغلق نے گنبد بنوایا تھا جو اب موجود نہیں۔ اس کی جگہ بعد میں اس سے بہتر گنبد اور تین طرف غلام گردش بنائے گئے۔ یہاں کی عمارت میں کئی دفعہ اضافے اور تبدیلیاں کی گئیں۔

شانِ کبریائی ایک وہ ہیں کہ اپنا مقبرہ خود بنوایا مگر زمانے نے اُسے مٹا دیا ایک یہ ہیں کہ اپنے پاس خدا کا نام اور روضۂ مبارک کی شوکت ہر روز ترقی پر ہے۔ بادشاہوں نے آپکا حلقہ بگوش ہونا فخر سمجھا۔

اظہارِ ارادتمندی کے لئے کئی اضافے کئے ؂

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما — حافظ

جوکوئی عشقِ الٰہی میں فنا ہُوا وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہوگیا۔

محمد بن تغلق نے سندھ کی ایک مہم پر دریائے سندھ کے کنارے ۲۶ سال کی سلطنت کے بعد مارچ ۱۳۵۱ئہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس کی سلطنت میسور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر بادشاہ کی ستم آرائیوں کے سبب ملک میں بغاوتیں بہت ہوئیں۔ اب فاتح دیوگری تغلق آباد میں تمام کرّ و فرّ سے معرّا مقبرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ جہاں نہ بخشش کے لئے ہاتھ دراز کیا جاسکتا ہے نہ رعایا ان کے ہاتھوں بے حال ہے۔ ہر متنفس کی آخری منزل یہی ہے۔ تغلق کا تمام زر و مال اس کے لئے موت کے عوض حیات نہ خرید سکا ہرضی یا مجبوری سے جامِ فنا پینا تو اس دہرِ ناپائدار کا دستور ہے لیکن آئینہ دل اور نیک اعمال تو جنت کے کھلے دروازوں کی طرف خندہ پیشانی سے قدم بڑھاتے ہیں۔ انتقال ان کے لئے راحت و آرام کی منزل تک پہنچنے کا پیغام ہے۔ مگر ہوس پرستوں اور سیاہ کاروں کے دل روزِ حساب اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی نار کے منظر سے دہل جاتے ہیں۔ انکے لئے ملک الموت کی آمد، اس سزا کا پیش خیمہ ہے جس کے لئے

عرصے سے ان کی گردن جلّاد کے خنجر کی منتظر نظر آتی تھی - اور وہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ اس کیفر کردار سے چند لمحے اور محفوظ رہ کر اس دارِ فانی میں گذار سکیں ۔ مگر

سودا پئے دنیا تو بہر سو کبتک؟ آوارہ ازیں کوچہ باں کو کبتک؟
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے؟ بالفرض ہوا یوں بھی ۔ تو پھر تو کبتک؟

مرزا رفیع سودا

۷۔ فیروز آباد

محمد تغلق کا کوئی بیٹا نہ تھا، امیروں نے فیروز شاہ تغلق کو جو بادشاہ کا بھتیجا تھا۔ تخت و تاج کے لئے منتخب کیا۔ فیروز شاہ اپنے چچا کا ضد تھا؛ بُعد المشرقین۔ اس نے رعایا کو بہت آسائش پہنچائی۔ محمد تغلق کے مظالم کے بدلے اس نے رحم اور معاوضے سے اُتارے۔ کئی کنوئیں، باولیاں، بند، مسجدیں، دار العلوم، سرائیں، حوض، حمام، پُل بنوائے۔ گو بڑے معرکے سر نہ کئے لیکن خلقِ خدا کو آرام بہت دیا۔ یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے باقاعدہ، بڑے پیمانے پر دریاؤں سے کاٹ کر، کئی نہریں جاری کیں۔ ان میں سے ایک "نہر جمن غربی" تھوڑی سی ردوبدل کے بعد اب بھی جاری ہے۔ یہ شہر دہلی کو سیراب کرتی ہے۔

اس کو شکار کا بہت شوق تھا "کوشک شکار" ایک عمارت بنائی جس میں عالیشان محل تھا۔ اس کی دیواریں بہت بلند تھیں۔ اس میں ایک چڑیا گھر بنایا۔ ملک ملک کے جانور اور پرندے وہاں لا کر جمع کئے۔ اس کا محلِ وقوع وہ مقام تھا جہاں اب اشوکا کی پتھر کی لاٹھ فلیگ سٹاف برج (بادٹہ) اور یادگار غدر کے درمیان ہندو راؤ کے باڑے میں موری دروازے کے باہر

واقع ہے۔ اس پہاڑی پر بہت سی عمارتوں کا ایک مجموعہ تھا جو فیروز شاہ نے بنایا۔ ان میں سے چوبرجی مسجد، پیر غیب کی درگاہ، اشوکا کی پتھر کی لاٹھ اور ایک سرنگ جو ایک کنوئیں اور پہاڑی کی چوٹی کے درمیان زیرِ زمین راستہ ہے، اب باقی ہیں۔ پیر غیب کی درگاہ کسی بہت بڑی عمارت کا ایک ٹکڑہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بناوٹ عجیب سی ہے۔ یہاں پر رصدگاہ (جنتر منتر) تھی۔ حضرت پیر غیب اورنگ زیب کے عہد میں ایک کامل بزرگ ہوئے ہیں۔ یہاں پر انہوں نے صرف چلہ کشی کی تھی گو اب ایک قبر بنا رکھی ہے۔ اشوکا کی لاٹھ بھی فیروز شاہ نے متھرا سے منگائی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں بارود کے ایک دھماکے سے ہوا میں اڑ گئی۔ اور اس کے پانچ ٹکڑے ہو گئے۔ آثار قدیم کے زمرے میں انہیں کلکتہ کے عجائب خانہ میں بھجوا دیا گیا۔ آخر کار ان کو جوڑ کر اصلی مقام پر لا کر نصب کر دیا گیا۔ ایک اور اسی طرح کی پتھر کی لاٹھ اس نے متھرا سے منگوائی تھی جو اب فیروز شاہ کے کوٹلے میں نصب ہے۔ کبھی اس کے اوپر سونے کا گولہ اور کلس لگا ہوا تھا۔ ایک الہ آباد میں بھی ہے۔ اسے قدیم عمارات کے مرمت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کی فیض رساں ذات نے سلطان غازی، معزالدین بہرام شاہ کے مقبروں کی مرمت کے علاوہ، جو ملک پور میں واقع ہیں، کئی اور مقبروں کی مرمت کرائی۔

اس کے عہد میں کئی مسجدیں بنیں۔ مثلاً چوبرجی مسجد جو کوشک محل کے قریب

فلیگ سٹاف برج سے اس طرف پہاڑی پر اب بھی کھڑی ہے۔ کلاں مسجد جو ترکمان دروازے کے اندر شاہجہان آباد میں کالی مسجد کے نام سے مشہور ہے، چونکہ امتدادِ زمانہ سے اس کا رنگ سیاہ ہو چکا ہے۔ رضیہ سلطانہ کا مزار یہاں سے قریب ہے۔ فیروز شاہ کے کوٹلے کی مسجد۔ حضرت نظام الدین کی درگاہ کی مسجد۔ کالو سرائے، بیگم پور، کھڑکی کی مساجد۔ درگاہ روشن چراغ واقع جہاں پناہ مقبرہ عالم شاہ اور قدم شریف بیرون کابلی دروازہ، کی فصیل یہ سب اسی بادشاہ کے زمانے میں بنے۔

عالم شاہ اس کے عہد میں ایک ولی اللہ تھے۔ مزار نجف گڑھ کے نالے کے اوپر تیمار پور سے پرے آبادی سے دور واقع ہے۔ نالے کے اوپر سڑک کے لئے ایک پل اسی عہد کا بنا ہؤا ہے۔ اور بڑی اچھی حالت میں ہے۔ اسکے ساتھ نالے کے دائیں کنارے پر مقبرہ اور اس کے گرد پرانا قبرستان ہے۔ درگاہ روشن چراغ کے احاطے میں ۱۳۵۶ء سے لیکر ۱۷۲۹ء تک ہر زمانے میں اضافے اور ایزادیاں ہوتی رہیں۔ آپ کا نام نصیر الدین محمود تھا۔ اور روشن چراغ دہلی مشہور ہوئے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور معنوی جانشین تھے وصال ۱۳۵۶ء میں ہؤا۔ قدم شریف میں فیروز شاہ کے بیٹے فتح خاں کی قبر ہے اور سرورِ کونین حضرت رسولِ مقبولؐ کے پاؤں کا ایک پتھر پر نشان ہے۔ جو بطور تبرک یہاں نصب کیا گیا تھا۔ اسکے گرد بہت بڑا قبرستان ہے۔ قبرستان کے پیچھے ذرا اونچائی پر جگہ

پشت کوہ کا حصہ ہے، پرانی عید گاہ ہے۔ اسکے گرد پختہ چار دیواری ہے۔
بیگم پور کی مسجد جہاں پناہ میں غالباً جامع مسجد تھی۔

تغلقوں کے موروثی دستور کے مطابق شہر بسانے کا وہم آپ کے دل میں بھی غالب آیا۔ ایک بہت بڑا شہر بسایا، "فیروز آباد" نام رکھا۔ اس کی تعمیر ۱۳۵۴ء میں شروع ہوئی۔ اب اس کا کچھ حصّہ باقی ہے جسے فیروز شاہ کا کوٹلہ کہتے ہیں۔ جو شاہجہاں آباد کے دہلی دروازے سے باہر تھوڑی دور واقع ہے یہ چھپا مقام تھا جہاں دار السلطنت دہلی کو منتقل کیا گیا (نقشہ ملاحظہ ہو)

اس وقت فیروز آباد بہت بڑا شہر تھا۔ اس کی آبادی بڑے پھیلاؤ میں تھی بعض کا خیال ہے کہ پرانے شہر کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ فیروز شاہ ایک نیا شہر بسانے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن کیا ضرور تھا۔ کہ جہاں پناہ سے ۸ میل کے فاصلے پر نیا شہر بسایا جاتا۔ یہاں اس نے کثیر التعداد عمارات بنائیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ شہر بسانے کا خیال اس بانیٔ عمارات کے دل میں پیدا نہ ہو وہ تو شاہی شان تھی۔

فیروز شاہ عمارتیں بنانے کا بڑا شائق تھا۔ اسکے عہد کی عمارتیں دور دراز تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سنگِ خارا کی دیواروں پر پختہ چونے کا پورا پلستر کیا جاتا تھا۔ اب تک اس کے زمانے کی کئی عمارتیں قائم ہیں۔

۱۳۰۳ء سے لیکر ۱۳۲۷ء تک ۲۴ سال کے عرصے میں سیری، تغلق آباد،

عادل آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، پانچ مقاموں پر فصلیں بنائی گئیں۔ اور آبادی کی گئی۔ ان میں دولت آباد کا نام شامل نہیں جو محمد تغلق کی جدت تھی (ان کے محل وقوع کے لئے نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ) شہر آباد کرنے کا جنون نہیں تو اور کیا ہے۔ توجہ ہے جسطرف ہو شاید اس وقت شہر بسانا ہی بقائے دوام کا موجب سمجھتے ہوں۔

فیروز شاہ کے دربار کی بڑی شان و شوکت تھی۔ اس نے حکمرانی اور رعایا پروری کے بہت سے اچھے طریقے اختراع کئے جن پر بعد کے حکمرانوں نے بھی عملدر آمد کیا۔ مصر کے خلیفہ نے اس کے لئے، اس کے بیٹے کے لئے اور اس کے وزیر کیلئے خلعتِ فاخرہ بھیجے۔ اس کا وزیر خانِ جہاں تھا جس نے بہت سی مسجدیں بنوائیں۔ اس عہد میں مغلوں نے حملہ کیا مگر منہ کی کھائی۔ اس نے دو دفعہ بنگال اور دو دفعہ سندھ پر خود چڑھائی کی۔

فیروز شاہ کی وفات ۹۰ سال کی عمر میں ۱۳۸۸ء میں ہوئی۔ اور علاء الدین کے حوض خاص کے کنارے، قطب کے شمال میں دو میل پر، اس کے بیٹے محمد چہارم نے اس کا مقبرہ ۱۳۸۹ء میں بنوایا۔ "وفات فیروز" ۷۹۰ھ

تمام دنیا میں اس وقت اور اس سے قبل شخصی حکومتیں تھیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ گڈریئے اور قزاق اپنی قوت بازو سے بادشاہ بن گئے۔ ایک نتیجہ جو ہم ہندوستان کی تاریخ سے اخذ کرتے ہیں یہ ہے کہ شخصی حکومت کیلئے

بادشاہ کا بذاتِ خود ہر طرح صاحبِ جوہر ہونا لازمی ہوتا ہے علم فن ہنر طاقت سخاوت اور دیگر تمام خوبیوں کا ایک فرد میں بدرجۂ اتم موجود ہونا ملک کی ترقی اور آسائش کے لئے ضروری ہے۔ جب کہیں یکے بعد دیگرے خاص وجوہات کے سبب ایک ہی خاندان کے کئی افراد کو قلیل عرصے میں تخت نشین ہونا پڑا یا ایک بادشاہ نے عرصۂ دراز تک حکومت کی اس کے جانشین کو تربیت کا کافی موقعہ نہ ملا۔ ان کے دل سے فوج کشی یا ملک رانی کی اُمنگ غائب ہو گئی۔ شہزادوں کی جوانی گذر گئی، بڑھاپے کی سستی اور ناطاقتی کے سبب سلطنت کے کاموں میں تن دہی سے حصّہ نہ لے سکے۔ اگر ایک صاحبِ تاج جابر اور سخت گیر ہوا اس کی اولاد کو بغاوت اور فرقہ بندی کے ذریعہ اپنی ذاتی تربیت کا موقعہ نہ ملتا اور وہ ضروری تعلیم اور واقفیت سے محروم رہ جاتے اس کا اثر یہ ہوتا کہ جانشین کمزور ہوتے، ان کی حکومت کرنے کی صلاحیت اور قابلیت معدوم ہوجاتی۔ جو اس زمانے کے صاحبِ تخت کے لئے لازمی تھی۔ اس وجہ سے خاندان صفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتا۔

فیروز شاہ کے وارث بہت ضعیف تھے۔ خاندان کے افراد میں ہر کوئی بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ تھوڑے عرصے میں نصیر الدین، غیاث الدین ثانی، ابوبکر اور ناصر الدین چار بادشاہ ہوئے۔ صوبے تمام خود مختار ہو گئے۔ اسوقت دو جگہوں پر فصیلیں اور شاہی محلات تھے۔ جہاں پناہ اور فیروز آباد۔ نوبت

بانیجار سید کہ ان دونوں مقاموں پر دو الگ الگ بادشاہ تھے۔ رعایا تو خواہ مخواہ پریشان ہوگی۔ ان دونوں دارالحکومتوں کے درمیان بہت سے معرکے ہوئے قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ رزم گاہ ان دونوں جگہوں کے مابین کا میدان قرار پاتا تھا۔ اس وقت صفدر جنگ، ہمایوں لودھیوں کے مقبرے موجود نہ تھے دیگر بہت سے قبے جو اب نظر آتے ہیں، اسکے بعد کے مغلوں کے زمانے میں بنے۔ پرانا قلعہ ضرور موجود تھا۔ مگر اس کی ہیئت بالکل مختلف تھی۔ اسکے سامنے کی مسجد اور مدرسہ (خیر المنازل) موجود نہ تھے۔ خدا جانتا ہے کیا کیا آفت برپا ہوئی ہوگی۔ کسی کے لئے مشغلہ، کسی کے لئے عذاب جان۔ ایک کا مذاق دوسرے کی موت۔ رعایا بہت پریشان تھی ہر طرف ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی جس کسی کے ہاتھ لگا ملک کے حصے بخرے کر لئے، خود مختار ہو بیٹھے۔

سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ اس وقت دہلی کیلئے ایک اور بلا نازل ہوئی یعنی تیمور لنگ کا حملہ۔ یوں تو التمش کے عہد سے مغل متواتر لوٹ کی غرض سے ہندوستان پر حملے کر رہے تھے، مگر بے ترتیب۔ مال غنیمت لیا۔ قتل و غارتگری کی، واپس ہو گئے۔ امیر تیمور پہلا بادشاہ ہے۔ جس نے باقاعدہ فوج لیکر اس زور کا حملہ کیا کہ کوئی تاب مقابلہ نہ لاسکا۔ ایک پاؤں دبا کر چلتا تھا اسلئے "تیمور لنگ" کہلایا۔ ایشیائے کوچک ترکستان، وسط ایشیا تمام اس کے زیر نگین تھا۔ عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی، ۱۳۹۸ء میں ترکوں تاتاریوں ایرانیوں کا

کثیر التعداد لشکر لیکر شمالی درّوں سے ہندوستان میں داخل ہُوا۔ آدمی دل گردے کا تھا، سر سے کفن باندھ کے چلا ؎

بتکدہ جنت ہے چلئے بے ہراس
لب پہ مومن ہر چہ بادا باد کیا
مومن

بلا روک ٹوک دہلی آ پہنچا۔ جو میدان مٹکاف ہوس سے لیکہ صفدر جنگ تک واقع ہے (نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ) اس میں لڑائی ہوئی۔ فیروز آباد کے بادشاہ نصیرالدین کے بیٹے محمود تغلق کو شکست ہوئی اور وہ گجرات کو بھاگ گیا۔

تیمور نے بادشاہت کا اعلان کیا اور فیروز شاہ کے کوٹلے کی مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ خیر یہاں تک تو کوئی بات نہ تھی لیکن تاتاری آنکھیں عنابی خونِ رواں کو ترستی ہیں۔ شوقِ خوں ریزی کچھ ان کو وراثت میں پہنچا ہے امیر تیمور حوض خاص کے کنارے مجلسِ عیش میں مشغول تھا۔ شہر پر گراں تاوان لگایا گیا۔ شاید تاوان کی ادائیگی میں تاخیر یا لیت و لعل ہوا ہوگا۔ قتلِ عام شروع ہُوا۔ توبہ الٰہی توبہ خون کے نالے بہ گئے کشتوں کے پُشتے لگ گئے۔ گلیوں میں چلنے کو رستہ نہ تھا۔ جو کوئی سامنے آیا قتل۔ پانچ دن تک یہ قیامت برپا رہی۔ کیا کچھ ہُوا ہوگا۔ اسکا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔ لاتعداد انسان تیغ کے گھاٹ اتر گئے۔ غرض یہ کہ کچھ نہ چھوڑا۔ خاکِ سیاہ اور ویرانی رہ گئی۔

جہاں پناہ کی بد قسمتی جو آئی تو وہاں فوج کے سپاہیوں سے کسی نے لے دے کی۔ قتلِ عام پھر شروع ہوا۔ چار دن تک جو کوئی سامنے آیا صاف لہو کی ندیاں رواں تھیں۔ اب قتل و غارتگری سے ہاتھ شل ہو گئے۔ دل تو نہ بھرا مگر بازو تھک گئے قتل بند ہوا جتنے باقی بچے ان کو قید کر کے غلام بنا لیا۔ شاید مستقبل میں مشق کا خیال ہو ؎

گو ہاتھ میں طاقت نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
غالبؔ

ایک ستم ظریفی اور ملاحظہ ہو۔ محمود شاہ تغلق کی لڑائی سے قبل تیمور کے ساتھ ایک لاکھ کے قریب قیدی تھے جو ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد جمع کئے گئے تھے۔ کوتاہ اندیش تھا نیچے آتے ہوئے غلام قید کرنے شروع کر دیئے ایک جھگڑا اور خرید لیا۔ جانتے ہوئے کرتا کیا آخر اسی ملک میں سے تو لوٹ کر جانا تھا۔ شاید یہ بھی کوئی مصلحتِ خسروانہ ہو؟ میدانِ جنگ میں اترنے سے پہلے ان لاکھ جانوں کی نسبت بچار ہوئی۔ یہی ذہن میں آیا کہ ایسا نہ ہو عین ہنگامۂ کارزار کے وقت یہ عقب میں اُدھم مچائیں۔ ان کا صفایا ہی کرنا بہتر ہے۔ ہمارے لئے اور بہت ہیں جہاں سے طبیعت چاہے گی، غلام بنا لیں گے۔ لاکھ جانوں کی صفائی کر دی۔ ایک لاکھ نہتے انسان دم کے دم میں خاک میں ملا دیئے صرف دہلی پر کیا منحصر ہے۔ تیمور لنگ جہاں سے گذرا زمین کا ذرہ ذرہ

اس کی جان کو روتا ہے - یہی قتل و غارتگری - ازراہِ تفنن یا احتیاطاً - کیا ذہن رسا پایا تھا - ایک آگ کا شعلہ تھا جو طوفانِ بادگردباد کی مانند چکر کاٹتا ہوا زمین میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھر گیا - اور جہاں سے گذرا خاکِ سیاہ اور راکھ کے ڈھیر راستے پر اس کی نشانی رہ گئے - یہ بھی کوئی مبالغہ آمیز بات نہیں کہ وہ جہالت کے زمانے بھی ایسے ہی تھے سارے عالم میں اس وقت یہی کچھ ہو رہا تھا مگر تاتاریوں نے شوقِ خونریزی وراثت میں پایا ہے -

تیمور میرٹھ اور ہردوار ہوتا ہوا سمرقند کو لوٹا - اپنے ساتھ بیقیاس مالِ غنیمت اور بے حساب قیدی لے گیا - دہلی بادشاہ کا پایہ تخت تھی - اب اس میں فقیر کی گودڑی بھی نہ رہی - یہ سچ ہے جو معراج ترقی پر ہوتا ہے جب مصیبت آتی ہے تو وہی ظلمات کی عمیق گہرائیوں میں جا گرتا ہے جب ستارہ گردش میں آتا ہے تو زمانے کا ظلم اسی پر ٹوٹتا ہے - بادِ تند کے سامنے گھاس کے تنکے تو زمین پر سر رکھ دیتے ہیں مگر قد آور درخت جب تابِ مقاومت نہیں لا سکتے تو جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں -

امیر تیمور دہلی میں صرف پندرہ روز رہا - مگر ہر روز ایک قیامت تھی - کل کیا معلوم کیا ہو جائے ویرانی اور وحشت کو چھوڑ کر باقی دارِ فانی کا تمام سامان تیمور اپنے ساتھ لے گیا - خون کے نالے تیموری قتل و غارتگری کا مرثیہ گاتے

تھے۔ باقی کیا رہا تھا۔ تاریخ میں کوئی اس کی نظیر نہیں۔ یہ اپنی طرز کا یکتا واقعہ ہے نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد ایسا عظیم و طویل قتل عام کا محشر خیز ہنگامہ کبھی بپا ہوا۔ یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ اس تباہی کے باعث جملہ سامانِ زلیست و عیش سے معرّا ہو کر کچھ عرصہ چین ملے۔ یہاں رکھا کیا تھا!

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو — غالبؔ

ہندوستان کی سلطنت پر تیمور گردی کا بڑا گہرا اثر ہوا۔

دہلی خاکِ سیاہ تھی پھر بھی دہلی تھی۔ محمُود تغلق گجرات سے واپس آیا کچھ کشمکش کے بعد پھر بادشاہ بنا۔ بیس سال برائے نام حکومت کے بعد ۱۴۱۲ء میں انتقال کیا۔

محمود کے ساتھ طرزِ تعمیر کا تغلقی دور ختم ہو گیا۔ قاعدہ ہے، آسائش کے لئے تعمیر میں ضرورت کے مطابق تبدیلی پیدا کر لی جاتی ہے۔ حالات کے مطابق ان میں اضافے یا ردّوبدل کیا جاتا ہے۔ تغلقی عہد سے قبل مغلوں نے ہندوستان پہ کئی دفعہ یورش کی تھی۔ یہ خدا کا قہر روز کی آفت بن کر دہلی کی فصیلوں تک چلا آتا تھا۔ ان کے حملے کا خدشہ ہر وقت لگا ہُوا تھا اس لئے یہ مصلحت سمجھی گئی کہ تمام عمارتوں کو قلعہ نما اور مستحکم بنایا جائے تاکہ حملے کے وقت حفاظت ہو سکے۔ گذشتہ عہد کی تعمیرات سے ایک سبق تغلقوں

نے حاصل کیا تھا۔ مخروطی شکل کا قطب مینار تو صحیح سالم کھڑا تھا مگر مسجد قوت الاسلام اور دیگر عمودی تعمیرات کی محرابیں مرمت طلب ہو چکی تھیں۔ اس زمانے میں، ایسا معلوم ہوتا ہے، بھونچال کے چند حادثے پے در پے ہوئے ہونگے اور عمارتوں کو نقصان پہنچا ہوگا۔ لازمی ہے کہ عمودِ دیوار کی عمارت جلد گر جائے، مگر ڈھلوان دیواریں صدمے سے محفوظ رہیں گی۔ ہندو طرزِ تعمیر نے بھی اب اپنا جائز اثر ڈالنا شروع کیا۔ ابتدائی دور کے اثرات کا سبب تو ہندو کاریگر تھے جنہوں نے ازخود تفصیلات کو عمارت میں شامل کر دیا مگر اب مسلمان نقشہ نویسوں نے اپنی مرضی کے مطابق مفید باتوں کو اخذ کر کے اپنی منشاء کے موافق اپنی تعمیرات کے نقشوں میں شامل کر لیا۔

ان تمام اثرات کے سبب سے عمارتوں کی بناوٹ مختلف ہو گئی تغلقوں نے سطحی نقش و نگار یک قلم ترک کر دیئے۔ سنگ مرمر یا روغنی اینٹوں کے استعمال سے عمارت کی خوبصورتی کو دوبالا نہیں کیا جاتا تھا۔ دیواریں سنگِ خارا کی اور پتھر نیم تراشیدہ، بڑی موٹی بھاری اور مضبوط۔ نیچے سے زیادہ چوڑی اوپر سے کم ہوتی جاتی ہیں۔ اس طرح دیواریں باہر کے رخ ڈھلوان ہوتی ہیں اور زاویہ بناتی ہیں اندر کا رُخ عمود الافق ہوتا ہے۔ تمام سطح پر پورا پکے چونے کا پلستر جو اب تک موجود ہے۔ بے کلس کے چپٹے سا سانی گنبد عمارت کے اندر کے رُخ چھپا لگا دیا جاتا تھا۔ آرائش، وزیبائش حتی الوسع

قلیل ترین استعمال کی جاتی تھی۔

نقشہ بہت صاف اور واضح تراش کا ہوتا تھا۔ نقشے کے لحاظ سے یہ لوگ کٹر تھے یعنی ہمیشہ ایک ہی وضع کے مطابق چلتے تھے۔ تجربہ سے بناوٹ بھی بہتر ہو چکی تھی۔ تغلق دور کی عمارتیں بہت سادہ ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جہالت اور فقدانِ تمدن کا گمان ہوتا ہے۔ مثالہ کے مناسب انتخاب کی طرف توجہ نہیں دی گئی نہ ہی رنگوں سے دلآویز اثر پیدا کیا گیا ہے صرف جسیم اور وزنی دیواروں سے مرعوب کن صورت پیدا کی گئی ہے۔ جو دیر تک قائم رہے بنگلوں کے حملوں کا ڈر ہر وقت لگا رہتا تھا اور اسلئے تعمیرات کو زیادہ مستحکم اور قلعہ نما بنانا ضروری تھا۔ اس عہد کی تمام عمارتوں کا نقشہ ایک ہی سا ہے۔ محراب اور گنبد کے لحاظ سے یہ دَور معیاری ساسانی طرز کے قریب تر ہے اور اس لئے ہندوستان میں اس طرزِ تعمیر کا نمائندہ کہلاتا ہے۔

تغلق آباد اور مقبرہ غیاث الدین تغلق اس عہد کی پہلی عمارتوں میں سے ہیں۔ تغلق آباد بڑی بھاری فصیلوں کی پُر شوکت عمارت ہے اسکے کونوں پر مہیب برج ہیں اور فصیلوں پر اوپر نیچے مورچوں کی کئی قطاریں ہیں غیاث الدین کا مقبرہ تغلق آباد کے قریب بنایا گیا۔ اس غرض کے لئے میدان میں بہت لمبا بند بنایا تاکہ پانی رُک جائے۔ یہاں پر بہت بڑے رقبے میں پانی ہر

وقت کھڑا رہتا تھا اور مقبرہ اس کے درمیان میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جھیل میں جزیرہ۔ مقبرے کی فصیل تکون ہے اور کونوں پر بُرج۔ تمام گرد مورچے بنے ہوئے ہیں اور فصیل کے اوپر کٹی ہوئی منڈیر ہے۔ دروازہ بہت محفوظ ہے۔ سیڑھیوں کے راستے ایک جگہ کاٹ کر اوپر جانا پڑتا ہے اور حملہ آور آسانی سے داخل نہیں ہو سکتا۔ مقبرے اور تغلق آباد کو ملانے کے لئے ایک محفوظ مورچہ دار اونچی دیواروں کا راستہ بنا ہوا ہے۔ ایک برج اس راستے کے سر پر باڑ مارنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ گویا قدیم عسکری اصولوں کی رُو سے یہ بڑا مستحکم قلعہ ہے۔ اسی میں ایک کونے کے بُرج کے اندر تغلق شاہ کے وزیر کی قبر ہے۔ اس پر بھی سنگ مرمر کا گنبد بنا ہوا ہے۔ فصیلوں کے اندر بادشاہ کا مزار سرخ پتھر کا بنا ہوا مربع کمرہ ہے جس میں تین قبریں ہیں۔ اس کی دیواریں باہر کی طرف ڈھلوان اور اندر کی طرف عمود الافق ہیں۔ زمین کے قریب اُن کی چوڑائی گیارہ فٹ سے زیادہ ہے مگر چوٹی پر صرف چار فٹ رہ گئی ہے۔

کھڑکی کی مسجد جو برجی مسجد کے نمونے کی بنی ہوئی ہے۔ اس عہد کی تمام مسجدوں کی بناوٹ ملتی جلتی ہے۔ پتھر کے عمود کھڑے کر کے ان پر ہم مرکز وضع کے پتھروں کی ڈاٹ لگائی گئی ہے۔ کھڑکی مسجد مربع کرسی پر رکھی گئی ہے۔ اسکے ۸۵ گنبد ہیں جو قد میں بہت بڑے نہیں۔ کلاں مسجد کی طرح اوپر ڈھلوان منارے بنے ہوئے ہیں۔ اندر کی طرف چھجا لگا ہوا ہے۔ اور دروازوں

کے اوپر ہندوانی طرز کا بھاری داسہ ہے، جو بریکیٹ کے اوپر رکھا ہوا ہے۔
بیگم پور کی مسجد کے بھی گٹی گنبد ہیں۔ کلاں مسجد کھڑکی مسجد کی طرح ہے مگر اس میں صرف ایک صحن ہے۔ حالانکہ کھڑکی مسجد میں چار ہیں۔ ڈھلوان دیواریں، سنگِ خارا کے عمود، نیم تراشیدہ پتھر کی محرابیں، اندر کی طرف بریکیٹ کے اوپر سہارا لئے ہوئے چھجا، اور چھت کے اوپر چھوٹے مخروطی منارے ویسے ہی ہیں۔ کلاں مسجد کے اوپر تین قطاروں میں ۱۵ اینچے گنبد تو مغربی حصّے میں ہیں۔ اور ۱۵ باقی تین پہلوؤں کی غلام گردش کے اوپر بنے ہوئے ہیں۔ ان عمارتوں کی استقامت چونے کی پختگی پر منحصر ہے چونکہ تمام پر پلستر کر دیا جاتا تھا۔ یہ تمام باتیں اس دور کی نمائندہ ہیں۔

کوٹلے کی جامع مسجد بھی ان سے ملتی جلتی ہے مگر اس کا دروازہ شمال کی طرف ہے۔ اسکے کبھی ۴۸۰ پتھر کے تراشے ہوئے کھمبے تھے۔ چاروں کونوں پر اونچے مینار دروازے پیتل کے دیواروں اور گنبدوں پر آیات کندہ تھیں تیمور نے اس مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس کی بناوٹ کو پسند کیا۔ اپنے ساتھ ہندوستان سے معمار لے گیا۔ سمرقند میں اسی طرح کی مسجد بنوائی۔ اب کوٹلے کی مسجد کا ڈھانچہ بھی بگڑ چکا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں باقی ہیں پتھر نکال نکال کر اور جگہ استعمال کر لئے گئے۔ گمان یہ کہتا ہے کہ عہد انگریزی میں شاہجہان آباد کی فصیل کی مرمت ہوئی تو اس میں قریب سے لیکر بنے بنائے پتھر لگا لئے گئے

کوٹلہ فیروز شاہ کے تمام محل گر چکے ہیں۔ ان کا چونا بڑا مضبوط ہے محرابوں سے بنائی ہوئی عمارت جس پر اشوکا کی لاٹھ ہے، جامع مسجد اور چند تہ خانے وغیرہ شکستہ حالت میں باقی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سے سرنگیں رج (ہندو راؤ کے باڑے) اور پرانی دہلی (قطب مینار کا علاقہ) کو جاتی ہیں۔

امیر تیمور قتل و غارت کے بعد سمرقند کو لوٹ گیا۔ جاتے جاتے خضر خاں کو نائب السلطنت مقرر کر گیا تھا۔ محمود تغلق کی وفات پر ایک معرکے کے بعد خضر خاں تخت پر بیٹھا۔ تیمور کا ڈر ایسا دل پر بیٹھا ہوا تھا کہ سمرقند خراج بھیجا کرتا تھا۔ چونکہ یہ سیّد تھا اس لئے خاندانِ سادات کا بانی ہوا، اس خاندان میں چار بادشاہ ہوئے۔ ان کی سلطنت کی کل مدت ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک ہے۔

نیا شہر بسانے کی دھن حسبِ معمول موجود تھی۔ خضر خاں نے ۱۴۱۸ء میں ایک نیا قلعہ بنایا۔ نام خضر آباد رکھا۔ اس کا اب نشان تک باقی نہیں۔ گو اس نام کی ایک بستی اس مقام پر اب بھی موجود ہے۔ اوکھلے کے قریب شاہجہان آباد سے آٹھ میل جنوب کی طرف اس کا مقبرہ اور یہ قلعہ تھا۔ مقبرہ تو آگرے کی نہر کی نذر ہوا۔

۱۴۲۱ء میں معز الدین مبارک شاہ ثانی، باپ کی وفات پر تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے ۱۴۳۳ء میں حکم دیا کہ جمنا کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا جائے۔ نام ظاہر ہے، "مبارک آباد"۔ نیا شہر بسانے کا سودا ہر دماغ میں تھا

اورغرض غالباً اپنے نام کو زندہ رکھنا تھی۔ تعمیر مکمل نہ ہوئی تھی کہ قتل ہؤا اور مبارک پور کے کوٹلے میں مدفون ہؤا۔ مبارک آباد کے نام ونشان، جو کچھ بھی یہ اس وقت تعمیر ہؤا ہوگا، امتدادِ زمانہ نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے ہیں۔ اپنا مقبرہ مبارک شاہ نے اپنی حیات میں خود بنایا تھا۔ اس کے بعد خضر خاں کا پوتا محمد شاہ بن فرید خاں ۱۴۳۳ء میں تخت نشین ہؤا اور بارہ برس سلطنت کی اس کا مقبرہ صفدر جنگ کے قریب موضع خیر پور میں لودھیوں کے مقابر میں واقع ہے۔ اوران سب میں بحیثیت ساخت بہتر ہے۔ اس کی سلطنت اتنی کمزور تھی کہ دہلی کے ساتھ کی لاڈو سرائے اور مہرولی کا گاؤں میواتیوں کے قبضے میں تھے۔

خاندانِ سادات میں آخری بادشاہ علاء الدین عرف عالم شاہ تھا۔ جس نے برضاؤ رغبت عنانِ سلطنت بہلول لودھی، اپنے سالارِ جنگ کے ہاتھ منتقل کردی۔

اب لودھی بادشاہوں کی باری آئی۔ یہ بادشاہ افغان تھے بہلول لودھی ۱۴۵۱ء میں تخت نشین ہؤا۔ اس نے بہت سی لڑائیاں لڑیں اور فتوحات کیں۔ جب بہلول لودھی دہلی سے غیر حاضر تھا۔ جونپور کے بادشاہ نے ۱۴۵۱ء میں دہلی کا محاصرہ کیا، مگر آپس کی پھوٹ کے سبب محاصرہ اٹھانا پڑا۔ آخر عمر میں بہلول نے دور دراز کے صوبے اپنے جرنیلوں کو دیدیئے۔ اور اپنے

لئے دہلی اور گرد و نواح کا علاقہ رکھ لیا۔ آخر ۱۴۸۹ء میں بیمار ہو کر راہی ملکِ بقا ہوا۔ مقبرہ روشن چراغ دہلی کے قریب جہاں پناہ میں واقع ہے جو اس کی حیات میں بنا تھا۔ اس کے عہد میں موٹھ کی مسجد بننی شروع ہوئی اور اس کے جانشین سکندر لودھی کے زمانے میں ختم ہوئی۔ شاہجہان آباد سے ۸ میل کے فاصلے پر موٹھ کی مسجد اپنے دور کی مسجدوں کا پاکیزہ نمونہ ہے۔ کہا جاتا ہے، سکندر لودھی کو اس وقت کی دہلی کی جامع مسجد کی دیوار سے ایک دانہ موٹھ کا ملا۔ اس نے اپنے وزیر میاں بھوئیہ کو بطور تحفہ دے دیا شاہی تحفہ بیکار نہیں جانا چاہئے۔ میاں بھوئیے نے اسے بویا۔ اس کی فصل کو پھر بویا حتےٰ کہ اس کی آمدنی سے یہ مسجد تیار ہوئی اور اس لئے موٹھ کی مسجد کہلائی ؛

۸۔ انتقالِ دارالحکومت

یہ ظاہر ہے کہ فیروزآباد، فیروزشاہ تغلق نے ۱۳۲۷ء میں بنایا تھا۔ جس کے بعد دارالسلطنت یہاں رہا قطب صاحب کے اردگرد کی بستی تو ایک قلعہ تھی اور فیروزآباد جانے سے پہلے دارالحکومت وہاں پر تھا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ جہاں پناہ مرکزی شہر تھا۔ جو کوئی بادشاہ اردگرد کی بستیوں کو ناپسند کرتا یہاں پر آکر آباد ہو جاتا اس لئے کئی دفعہ دارالسلطنت بنا اور پھر اُجڑ گیا۔ یہاں پر آبادی بھی اوائل سے چلی آتی تھی۔ جہاں پناہ کی فصیل بننے سے قبل، کلوکھڑی، سیری، تغلق آباد، عادل آباد باری باری آباد ہو چکے تھے۔ جب امیر تیمور ٹڈی دل لشکر لے کر آیا تو اس نے فیروزآباد کا ہی محاصرہ کیا تھا چونکہ بادشاہ وہاں پر رہتا تھا۔ اسکے بعد خاندانِ سادات میں خضر خاں نے خضرآباد اور مبارک شاہ نے مبارک آباد دو قلعے بسائے جہاں پر وہ اپنے عہد میں حکومت کیا کرتے تھے ؎

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت   رفت منزل بدیگرے پرداخت   سعدی

اب جو لودھی بادشاہوں کی باری آئی تو انہوں نے دیکھا کہ دہلی کا تمام خطہ پُر ہو چکا ہے۔ اس میدان کے چپے چپے پر مزار اور قبریں ہیں یہاں

پر نیا شہر کیا بسایا جا سکتا ہے۔ مگر نئے شہر کے بسانے کا سودا ضرور تھا۔ بہلول لودھی کی وفات پر اس کا بیٹا نظام خاں، سکندر کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ حضرت نے حکم دیا کہ دہلی سے دار السلطنت بدل دیا جائے۔ سبب یہ ہوا کہ ایک سال قبل سخت گرمی پڑی اور وبا پھیل گئی تھی۔ ایک مجلس مقرر کی گئی کہ جمنا کے کنارے مناسب مقام کا انتخاب کرے۔ انہوں نے آگرہ پسند کیا بادشاہ نے وہاں پر عمارات بنائیں اور ۱۵۰۴ء میں دار السلطنت کو وہاں تبدیل کر دیا۔ شدید بھونچال کے سبب دوسرے ہی سال بہت سی عمارتیں گر گئیں مگر اس نے شہر کو نہ چھوڑا

شانِ خدا۔ دلّی چھوڑی مگر جمنا جی کا پلو نہ چھوڑا۔ اس کے سندر سروپ نے جگت کا من ہر لیا تھا۔ پوتر جل دیوی کا پریتم روپ ہی حق رکھتا تھا۔ آگرہ مناسب خیال کیا گیا جو لبِ جمنا واقع ہے۔

پرانے زمانے میں جب کہ آب رسانی کے ذرائع بہت کم تھے یہ ضروری امر تھا کہ شہر کو دریا کے کنارے بسایا جائے۔ چنانچہ دنیا کے تمام بڑے بڑے قدیم شہروں کا محلِ وقوع کسی دریا کے کنارے پر ہے خطۂ دہلی کی بستیوں میں پرانا قلعہ قدیم ہے۔ جب "اندرپت" بنا تو اس میں کسی کو کلام نہیں کہ اس کی دیواروں کے نیچے دریا بہتا تھا۔ اب تک آثار موجود ہیں۔ اگر اب بھی تمام نہروں کو بند کر دیا جائے تو غالباً جمنا کی دھار لال قلعے، فیروز شاہ کے کوٹلے

اور پرانے قلعے کے برابر سے ہو کر گذرے۔ رائے پتھورا کے لال کوٹ کی باری آئی تو اس کے نیچے دریا موجود تھا۔ روز اشنان اور ہون ہوتے تھے۔ دریا کی لہر قادر مطلق کی جھلک رکھتی ہے۔ گاہے چنیں گاہے چناں۔ جدھر من میں آیا چل نکلی۔ کسی کی پرواہ لحاظ نہیں۔

جمنا کا رُخ بدلا اور اس کا پانی لال کوٹ سے ہٹ گیا۔ مگر شہر کو ساتھ سرکایا نہیں جا سکتا۔ اگر ممکن ہوتا تو اس کوشش سے بھی پہلوتہی نہ کی جاتی۔ دریا اور شہر کا درمیانی بُعد بڑھتا چلا گیا۔ مسلمان آئے انہوں نے اسے بہت وقعت نہ دی چونکہ ان کی مذہبی رسومات میں اسے بہت دخل نہ تھا۔ شہر کا مقام معین ہو چکا تھا لہذا یہیں پر توسیعات ہوتی گئیں۔ سیری بنی لال کوٹ کی مرمت ہوئی اس میں ایزادیاں اور اضافے کئے گئے۔ جہاں پناہ کی محکم فصیل کو تعمیر کیا۔ لیکن اب کے نیا شہر جو بسا وہ پھر دریا کے کنارے تھا۔ آخر پانی اور جان کا روح اور جسم کا تعلق ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ حَيٍّ مِنَ الْمَاءِ

(تمام چیزوں کی زندگی پانی سے ہوتی ہے)

کلوکھڑی کے پاس جمنا بہتی تھی۔ تغلق آباد دریا کے قریب آباد کیا گیا ہوگا مابعد عادل آباد اس کے پاس۔ جب فیروز آباد کی باری آئی تو دریا کا لحاظ رکھا گیا۔ خضر آباد بھی دریا کے اوپر تھا۔ مبارک آباد تو آباد ہی دریا کے

کنارے کیا گیا تھا۔ دہلی چھوڑ آگرے کی راہ لی تو وہاں بھی دریا ہی پیشِ نظر تھا۔ شاہجہاں نے لال قلعہ اور شاہجہاں آباد بسایا تو دریا کے عین اوپر تھا گویا دریا نے دہلی کے مختلف شہروں کا محلِ وقوع معین کرنے میں بہت حصّہ لیا عہد انگریزی کی دہلی کے پرانے سکریٹریٹ کی عمارت اور اسکے متعلقہ رہائشی مکان تو ضرور جمنا کے بہت قریب ہیں مگر نئے سکریٹریٹ کی عمارت سے دریا کا کوئی تعلق نہیں۔

کہتے ہیں بہتا پانی بصارت کو تقویت دیتا ہے ؎

چشم را بینائی افزاید سہ چیز ۔ سبزہ و آبِ رواں و روئے خوش

دوسرا شعر ہے ؎

کالبد را فربہی مے آورد ۔ جامۂ قز جانِ بےغم بوئے خوش

اقبال اور مغل تو کابل کی کاریزوں پر مٹے ہوئے تھے فیض بازار اور چاندنی چوک میں نہر جاری کردی۔ لال قلعہ کے اندر نہروں کا جال بچھادیا۔ ذرا آنکھیں بند کرکے تصور میں نقشہ جماؤ۔ لال قلعے کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتا ہوا دریائے جمن خرام ناز سے بہہ رہا ہے۔ رات کا پہلا پہر گذر چکا ہے۔ زندہ معمورۂ عالم کی شور و غل سے بھرپور فضا سکوت اور خاموشی میں بدل چکی ہے قلعے کے اندر اور دیواروں پر حسب معمول تمام چراغاں ہو رہا ہے۔ چاند اپنی پوری آب و تاب میں ضیا پاشی کرتا نظر آتا ہے۔ کھلی چاندنی سے دریا سیماب کا فوارہ

بنا ہوا ہے۔ آسماں پہ کہیں نقرئی کناروں والے سیاہ بادل بھی موجود ہیں کہیں کوئی روشن تارا آسمان پر اور انعکاس سے ہزار بکھرے موتی جمنا کے پانی میں نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کے بہترین مغنی، اپنا جوہر دکھانے کے لئے تانیں اڑا رہے ہیں جسم، روح، ہوا، فضا تمام مستِ نغمہ ہیں کبھی بھاگ میں شنکرا کی ملاوٹ اور کبھی کانڑے میں ملار اور بھاگیسری کے پلٹے۔ کبھی کامود اور مالکوس کا الاپ۔ ہوا پہ بہتے ہوئے رنگوں کے دریا قوسِ وقزح کے مشابہ یہ سُر کا دریا سننے والے کے حواس کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ ہر عنصر کا لطف جداگانہ مگر ارتباط اور ملاوٹ سے لطف چند در چند ہو جاتا ہے خاکی ہستیاں ان روحانی لہروں سے فرحت بخش اور روح پرور پیغام ساکنینِ فلک کو پہنچاتی ہیں۔ لونڈیاں، کنیزیں، خواجہ سرا صحن میں متحرک بتوں کی طرح خاموش، چکّر کاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر موہنی مورت۔

اٹھتا جوبن گدرا گدرا۔ آپ ہی من میں کھب جائے —— لوچ بدن میں پھولوں کی ڈالی

ایک گھلاوٹ یکسر چھائی، بیساختہ جی للچائے —— موہنی مورت موہنے والی

چال رسیلی جھومتا بادل، یا کوئی ندی لہرائی —— چور جوانی اٹھلاتی

ڈرتی ڈرتی، بچتی بچاتی، رکتی رکاتی شرمائی —— دل کو مسلتی دل تڑپاتی

مولوی محمد عظمت اللہ خاںؒ

اس عیش و نشاط کے صنمخانے میں رنج ناتوانی اور بڑھاپے کا کیا کام۔ جس

شوکت سے دنیا کی عیش و نشاط کی بہترین محفل مرتب ہوئی تھی اسی بہار میں اب اس کا رنگ جم چکا ہے۔ ہر عنصر مہیا ہے۔ ہر جزو موجود۔ ساقی و ساغر، مطرب و نگار، کتاب بہار آب رواں بوئے خوش۔ رنگ ملاحظہ ہو ؎

قلب کو فرحت، روح کو راحت، عقل کو قوت، طبع کو جودت
جلوۂ ساقی نغمۂ مطرب نالہ بہ چنگ و نشہ بہ صہبا
خندۂ گل پر نثار مل پر سرو چمن پر لطف سخن پر
نغمۂ بلبل نالۂ صلصل قہقہۂ قلقل بر لبِ مینا
ساقیٔ مہوش مستِ شبانہ مطرب دلکش صرفِ ترانہ
مژدۂ عید اقبال مجسم وقتِ سعید انوار سراپا
اک بتِ ترسا، بادلِ سنگیں۔ لعبتِ کافر باہمہ تمکیں
صورتِ لات و شکلِ منات و رشکِ یعوق و غیرتِ عزیٰ
کانِ ملاحت بحرِ صباحت جوئے فصاحت گلشنِ راحت
شور میں لیلےٰ نور میں سلمےٰ لہجہ میں شیریں جلوہ میں عذرا
وہ لبِ میگوں عارضِ گلگوں وہ قدِ موزوں چشمِ پرافسوں
برگِ گلِ تر، لالۂ احمر سرو صنوبر نرگسِ شہلا

(ابراہیم ذوق)

کیا بتائیں، کیا عالم ہو گا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمیں است سعد اللہ وزیر

پانی کا کنارہ ہمیشہ سے دلکش منظر رہا ہے۔ روشن آرا باغ بنایا، دریا کا کنارہ نہ تھا۔ اس کے بیچوں بیچ ایک جھیل بنا دی۔ آب رواں کا جو قابلِ ستائش استعمال شاہجہان نے کشمیر کی عمارتوں میں کیا، اسے دیکھ کر پانی کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ کشمیر کا پانی بھی، شفاف اور مصفا نوشدار و کی نہر چلتی ہے۔ خطۂ جنت نظیر ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید

گر مرغ کباب است پر و بال برآید عرفی

سوریوں کے عہدِ حکومت میں سلیم گڑھ (قلعۂ معلّے کے ساتھ) کا مضبوط قلعہ بنا تھا۔ اس کی شکل اور بناوٹ اس طرح کی رکھی گئی ہے کہ پانی اس کے گرد بہتا ہو گا۔ دریا کے رخ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ چوڑی پیشانی پر دھار منقسم ہو جاتی تھی اور نوک کی طرف دونوں حصے پھر آ کر مل جاتے تھے۔ جبتک لال قلعہ مغلوں کے قبضے میں رہا اس کی خندق میں پانی بھرا رہتا تھا۔ دریا کا پانی سلیم گڈھ اور لال قلعے کے بیچ میں سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس پانی کا ایک حصّہ قلعے کی خندق میں شمال کے منفرجہ

کونے کی طرف سے داخل ہوتا تھا اور خشکی کی طرف کا تمام چکر کاٹتا ہوا دوسری طرف پھر دریا میں جا ملتا تھا۔ جہاں یہ پانی خندق سے باہر نکلتا تھا وہاں لال قلعے کا ایک دروازہ ہے۔ اسی رعایت سے اس کا نام "آبی دروازہ" رکھا گیا۔ اسکے ذریعہ کشتی میں بیٹھ کر دریا میں جا سکتے تھے۔

سکندر لودھی نے دار الحکومت کو بدل دیا۔ جمنا کے کنارے آگرہ پسند کیا اور تمام شاہی کاروبار اپنے ہمراہ وہاں لے گیا۔ اب ہندوستان کا دار السلطنت آگرہ ہوا۔ سلطنت کے کام کاج وہیں سرانجام پاتے تھے امراء وہیں رہتے تھے۔ مگر دہلی بھی پایہ تخت کہلاتی تھی۔

گو اب دہلی سے بادشاہ چھن گیا لیکن شوکت و عزت کم نہیں ہوئی جب تک کہ نئے بادشاہ کی تاجپوشی دلّی میں نہ ہو چکتی تھی یہ رسم مکمل خیال نہیں کی جاتی تھی۔ سلطنت کے کاروبار میں دہلی اتنی ہی اہم تھی جتنا آگرہ بادشاہ دورے پر رہتا تھا اور اکثر اوقات دراز مدت تک دہلی میں قیام کرتا تھا۔

آگرے میں مقام سکندرہ جہاں اکبر بادشاہ کی قبر ہے سکندر لودھی کا بسایا ہوا ہے اس نے قطب مینار، فیروز شاہ کے مقبرے اور دیگر قدیم عمارتوں کی مرمت کرائی۔ ۲۸ برس کی حکومت کے بعد نومبر ۱۵۱۷ء میں آگرے میں انتقال کیا مگر لودھیوں کے مقابر، واقع موضع خیر پور میں

لاکر دفن کیا گیا۔ اس کا مقبرہ عالیشان ہے۔ اس کے گرد احاطے کی چار دیواری بھی ہے۔ خدا کی شان حکومت کو آگرے لیگیا مگر جہاں کی مٹی تھی وہیں آکہ پیوند خاک ہوئی۔

سکندر لودھی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی وارثِ تاج وتخت ہوا۔ اس کا دارالحکومت بھی آگرہ ہی تھا۔ اس کے عہد میں خیر پور میں، لودھیوں کے مقابر میں سے سکندر لودھی کا مقبرہ و مسجد تیار ہوئے۔ یہ اپنے امرا وزرا سے بداخلاقی سے پیش آتا تھا اس لئے آپس میں نفاق رہتا تھا۔ آخر کار اس کے بھائی علاءالدین نے علم بغاوت بلند کیا اور دہلی پر ۱۵۲۵ء میں قبضہ کر لیا۔ ابراہیم نے معرکے کے بعد اس سے شہر خالی کرالیا اور علاءالدین پنجاب کو بھاگ گیا۔ وہاں سے اس نے کابل کے بادشاہ بابر کو پیغام بھیجا۔ اس میں پنجاب کا صوبہ دار اور سلطنت کے دیگر وزیر بھی شامل ہوئے۔ بابر اس سے پہلے بھی ہندوستان پر چار دفعہ حملہ آور ہوا تھا۔ لیکن لاہور سے واپس پھر جاتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مستقل طور پر دہلی کے تخت پر قبضہ کرے۔ بموقع غنیمت جانا۔ جب سندھ کو عبور کیا اس کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج تھی۔ ابراہیم کا لشکر بیشمار تھا۔ پانی پت کے میدان میں لشکر مقابل ہوئے ابراہیم کو ۲۱۔ اپریل ۱۵۲۶ء کے دن شکست ہوئی۔ بابر کی فتح کا سبب اس کی ذاتی بلند

حوصلگی اور بہتر عسکری نظام تھا۔ ابراہیم بہادروں کی طرح میدان کارزار میں کام آیا اور وہیں دفن ہوا۔

شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۳ء میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۵۲۶ء تک پانچ خاندان برسرِ حکومت ہوئے اور کم ازکم پچیس ۲۵ بادشاہوں نے ہندوستان کا تاج اپنے سر پر رکھنے کا فخر حاصل کیا۔ وہ تمام حکمران اور شاہی خاندان باری باری مٹ گئے۔ اب بابر نے ہندوستان کے تاج اور تخت کو سنبھالا اور اس کی اولاد عرصے تک شہنشاہ کہلائی۔ وہ بھی آخر ۱۸۵۷ء کی غدر گردی میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

دنیا کیا ہے؟ تماشا گاہ ہے ایکٹروں کیطرح ایک جاتا ہے ایک آتا ہے کوئی کام ختم کئے۔ کوئی کام کو ادھورا چھوڑے۔ کوئی کام کے منصوبے گانٹھے اور کوئی اس غم میں کہ غمِ دنیا نے اسے اتنی فرصت بھی نہ دی۔ ثروت و عظمت بھی ایک کھیل ہے۔ دولت آتی ہے۔ جمع ہوتی ہے، اور بکھر جاتی ہے اگر دنیا کی نیرنگی کا صحیح نقشہ دیکھنا ہو تو صحرائے ریگ کا منظر ملاحظہ کرو۔ بادِ صرصر کے جھونکے ایک مقام پر جہاں پہلے کنکری تک نہ تھی ریت کے ذرات کو جمع کر کے ایک عالیشان ریت کا ٹیلا کھڑا کر دیتے ہیں جو پہاڑ معلوم ہوتا ہے دوسرے دن وہی ہوا، اسکو بکھیر کر چھوٹے چھوٹے ٹیلوں میں منقسم کر دیتی ہے۔ جو پہلے ٹیہ سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ چندروز بعد وہاں پر کچھ بھی موجود نہیں ہوتا

نہ چھوٹے نہ بڑے، تمام مٹ کر فرشِ خاک کے برابر ہو جاتے ہیں اور سطح ہموار نظر آتی ہے۔ دو دن کے بعد بہت دور کچھ بلندیاں سی نظر آتی ہیں۔ اب ریت کے ذرّات نے پرانا مسکن چھوڑ اس مقام کو آباد کر لیا ہے۔ دنیا کا زر و مال لعل و جواہرات ان ریت کے ذرّوں کی مانند ہیں۔ کبھی کہیں ہے کبھی کہیں بنتی ہے بگڑتی ہے جمع ہوتی ہے پھر بکھر جاتی ہے۔ اور یہی دور قائم رہتا ہے۔ دولت ایک فریب وہ خوش منظر ساحرہ ہے۔ جو دل چھین کر اپنا گھونگھٹ اتار طالبِ دیدار کے منہ پر ڈال دیتی ہے اور ایسا جادو کا حلقہ اس کے گرد لپیٹتی ہے کہ ناظر اپنا دماغ اس کی نذر کر دیتا ہے ؎

برمال و منالِ خویش مغرور مشو وز نشئہ این شراب مسرور مشو !
درآمد و رفتِ این تفاوت نبود دلشاد ازیں مباش و رنجور مشو!

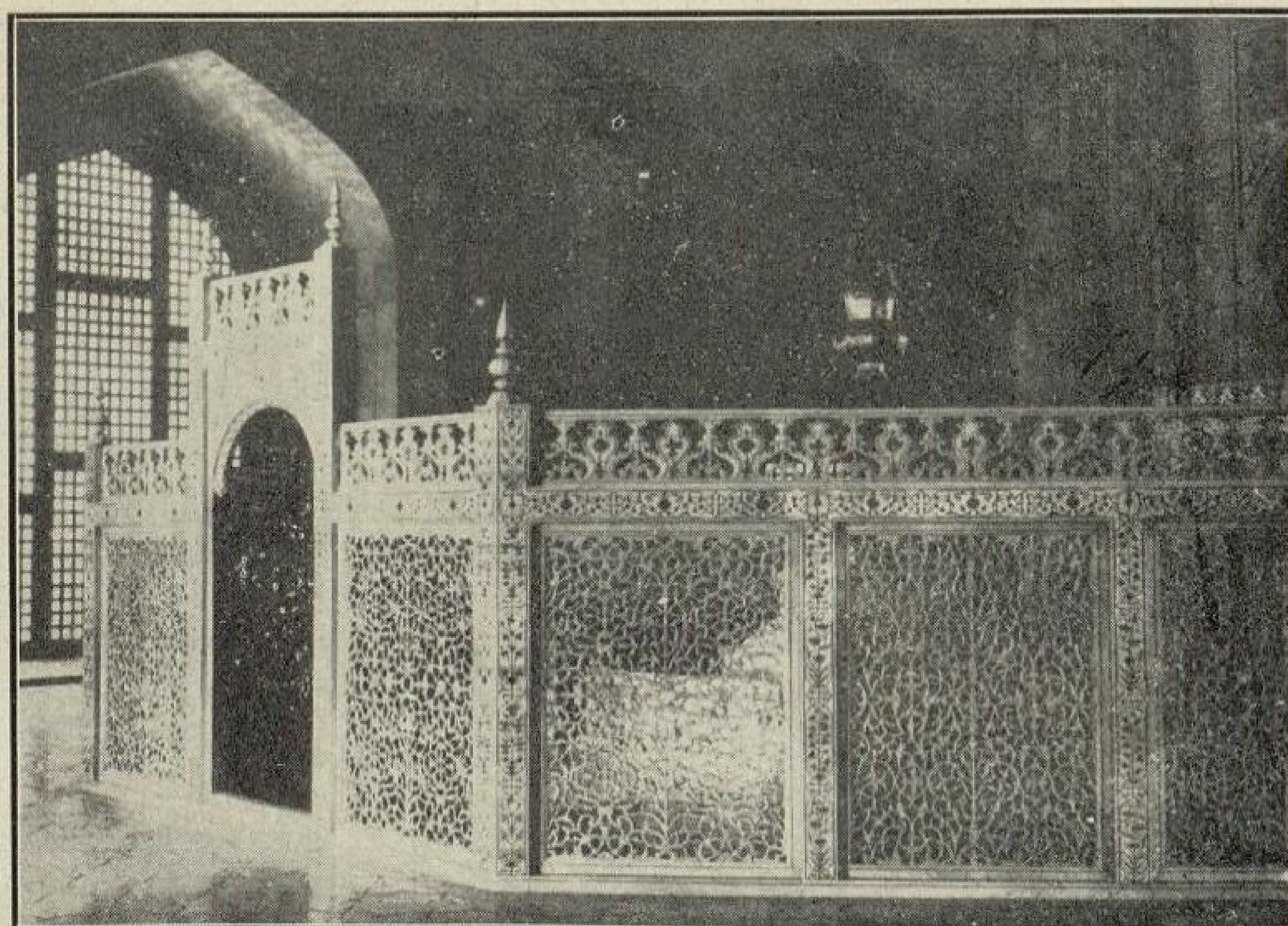
شہید

دنیا کی مجموعی دولت کی مقدار معین ہے۔ نہ زر و مال اس کرۂ جہاں سے کہیں باہر جاتا ہے اور نہ لعل و جواہر میں کوئی اضافہ ہوتا ہے صرف یہ کہ خزائن و دفائن اپنی جگہ کو بدلتے رہتے ہیں۔ (ساری دنیا کو گنو) زمانہ وار۔

کبھی فغفورِ چین کے خزانے ان سے پُر ہیں تو کبھی عزیزِ مصر کے۔ کبھی خلفائے بغداد ان جوہرات پر ناز کرتے ہیں تو کبھی چنگیز اور ہلاکو۔ کبھی

دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک

مقابل صفحہ 99



تاج محل آگرہ (اندر سے)

دارا کو انہی محلات پر ناز تھا۔ اور کبھی سکندر انہی پر فخر کرتا تھا۔ کبھی یونان کے جہانگیر سریر آرا کے پاس تھے تو کبھی قیصر اور قصرٹے کے پاس۔ اب انگلستان فرانس اور امریکہ انہیں پر ناز کرتا ہے۔ طوطاحمون بادشاہ مصر (سال حکومت)
کی قبر سے اسے جب کھودا گیا تو جواہرات کا بیش بہا خزانہ نکلا۔ قارون، نوشیرواں، ماموں رشید، سب یہیں پر چھوڑ گئے۔ روح چلی گئی بدن باقی رہ گئے۔ اور سکندر تو

آخر کار جب یہاں سے چلا ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

ابھی کل کی بات ہے۔ زارِ روس دنیا کا سب سے بڑا خود مختار اور جرّی بادشاہ تھا۔ اس کے تصوّر سے انگلستان جیسے ملک کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے وہ ہوّا تھا۔ ڈراوا جسے ریچھ کا نام دیا جاتا ہے۔ جب آخری زارِ روس اور اس کے خاندان کے حشر کا خیال آتا ہے تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ زار جس کی سلطنت جاپان کے ساحل سے لے کر یورپ کے بائیں کنارے کے سمندر تک پھیلی ہوئی ہو۔ جس کے زیر نگیں پرانی دنیا کا نصف سے زیادہ حصہ ہو وہ سر بازار پھانسی پر چڑھتا ہے۔ اور اس کے خاندان کا ایک ایک فرد اس طرح سے تلاش

کے بعد بے دریغ قتل کیا جائے جیسے حفظانِ صحت والے پلیگ کے چوہے کو مارتے ہیں۔

کہتے ہیں کوئی بادشاہ کہیں سیر کر رہا تھا۔ اس کے لباسِ حریر میں تکمہ ہائے لعل ٹکے ہوئے تھے۔ زرتار اور سنہری جھلمل جھلمل سے نظر نہ جم سکتی تھی۔ ایک قلندر لنگوٹی باندھے، ہاتھ میں نے ادھر آ نکلے۔ بادشاہ کے لباس کو دیکھتا اور ناچتا تھا۔ خوش ہوتا تھا۔ بادشاہ نے سبب پوچھا تو عرض کی حضرتِ سلامت یہ لعل و جواہر دیکھنے کے مطلب کے ہیں۔ نہ آپ ان کو نوشِ جان کر سکتے ہیں۔ نہ میں کھا سکتا ہوں۔ آپ بھی دیکھتے ہیں۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں فرق اتنا ہے کہ آپ کو ان کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ اور میں اس تکلیف سے مبرّا ہوں۔ جاتے ہوئے آپ بھی انہیں چھوڑ جائیں گے۔ سو میں خوش ہوتا ہوں۔ دنیائے دوں کی دولت کا جو اعتبار کرے وہ اپنے آپ کو گمراہ کرتا اور دھوکا دیتا ہے۔

اب بابر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو تو دارالسلطنت آگرے بھیجا اور خود دہلی آیا۔ تخت نشینی کی رسومات بدھ کے دن ۲۴ اپریل ۱۵۲۶ء کو ادا کی گئیں۔ بابر نے تزکِ بابری میں خود حالات لکھے ہیں۔ وہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی

کی زیارت کے لئے گیا تھا۔ اس نے حوضِ خاص حوضِ شمسی، علاء الدین کا محل قطب مینار، بہلول لودھی اور سکندر لودھی کے مقبرے بھی دیکھے۔ اس وقت ان کی کیا شان ہوگی۔ آج سے چار سو سال پیشتر لودھیوں کے مقبرے تو بالکل نئے بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد بابر کشتی میں بیٹھ کر آگرے چلا گیا اور پھر واپس آنے کی زندگی نے مہلت نہ دی۔ بابر پہلا فاتح ہے جو اپنے ساتھ توپ خانہ لایا اور اس کا استعمال ہندوستان کی سرزمین میں شروع کیا۔

ظہیر الدین محمد بابر ایک عظیم الشان سلسلۂ شاہانِ ہند کا بانی ہوا، جو خاندانِ مغلیہ کہلاتا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں یہ لوگ ترک تھے مغل نہ تھے۔ طرّہ یہ کہ بابر خود منگول قوم کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ مگر یہ افرنگی تاریخ نویسوں کی ستم ظریفی ہے کہ اس کو دی فرسٹ گریٹ مغل۔ پہلا مغلِ اعظم۔ ہی بنا کے چھوڑا۔ کچھ اس لئے کہ بہت عرصے سے شمال کی طرف سے مغلوں کے متواتر حملے ہو رہے تھے۔ جو کوئی آیا وہ مغل کہلایا تحقیق سے دیکھا جائے تو بابر چھٹی پشت میں تیمور کی اولاد میں سے ضرور تھا مگر والدہ کی طرف سے اس کا نسبی تعلق چنگیز خاں سے بھی تھا۔ اس لئے اس میں منگول اور تاتاری دونوں خونوں کی آمیزش تھی وہ اعلےٰ ادیب تھا۔ توزکِ بابری موجود ہے۔ مغل اور

منگول مترادف الفاظ ہیں۔ بابر نے ابھی گیارہ موسم بہار ہی دیکھے تھے کہ اپنے باپ عمر شیخ مرزا کی ناگہانی وفات پر وہ فرغانہ کا بادشاہ بنا۔ فرغانہ افغانستان کے شمال کی طرف بخارا سے ادپر ہے۔ چھوٹا سا علاقہ ہے۔ جو اب روسی ترکستان میں شامل ہے۔ اس کا پایہ تخت تو اندیجان تھا مگر بڑا شہر سمرقند ہے۔

بابر۔ ترکی میں شیر کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اس نے چار سال کے قلیل عرصے میں پنجاب راجپوتانے اور بہار پر قبضہ کر لیا۔ مگر زیادہ زندہ نہ رہا۔ ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ مزار کابل کے مضافات میں پہاڑی کے دامن میں ایک پر فضا چمن "باغِ بابر" میں واقع ہے۔ اپنی وصیت کے مطابق وہاں دفن کیا گیا منعمی تم نے مغل شہنشاہوں کے جدِ امجد کی آخری نشانی بھی تو دیکھی ہے۔ لوح مزار تو صاف ہے۔ وہ حوض بھی اب تک موجود ہے جہاں آپ " بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کو عملی جامہ پہنایا کرتے تھے۔ اسے شراب سے لبالب بھرتے اور پیتے۔ یہ حوض بھی پیالہ نما ہے۔ مگر مزار کی نہ چھت ہے۔ نہ کوئی چراغ جلاتا ہے۔ باہر باغ ہے۔ اور اندر ویرانی کا عالم۔ تو پھر یہ واویلا کیوں۔ یہی سمجھ لو کہ یہی بابری کھیل کئی بار کھیل چکے

ہوسہ

اے دل بکامِ خویش جہاں را تو دیدہ گیر
دروے ہزار سال چو نوح آرمیدہ گیر

اکبر کا نورتن ابوالفضل اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔ ہمایوں بخار سے بیمار ہوا۔ طبیبوں نے مرض لا علاج ٹھہرایا۔ بابر تین دفعہ اس کے پلنگ کے گرد گھوما اور لیٹ گیا۔ ہمایوں بھلا چنگا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بابر بیمار ہوتا گیا حتیٰ کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ کیا قربانی ہے! جان سے عزیز دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ کس قدر ایثار اور مردانگی ہے۔ بابر جتنا شہ زور اور ہمت کا یکتا تھا اتنا ہی جوانمرد اور بلند حوصلہ بھی تھا۔ وہ متعدد صفات کے سبب تعریف و ستائش کا مستحق ہے۔ اس کے اور کئی قصے مشہور ہیں مگر اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ اپنی رضا سے جان نثار کر دی تاریخ ہوئی "ہائے بابر وفات کردہ"
۹۳۷ھ

شخصی حکومت کے زمانے میں بادشاہ کی ذات پر سلطنت کے عمدہ یا ابتر نظم و نسق کی حالت میں ہونے کا بہت انحصار تھا۔ اس فردِ واحد کی طرزِ زندگی ہر شعبے میں مثالاً یا خیالاً عمائدو اکابر کے لئے رہنمائی کا باعث ہوتی تھی۔ تمام کارخانہ اسی روش پر چل نکلتا تھا۔ گویا بادشاہ کا مذاق، اوصاف و اطوار ملک کی ترقی اور آسائش پر گہرا اثر رکھتے تھے۔ تمام اعلیٰ اوصاف

بابر میں موجود تھے۔

بابر کی توزک اس کی ایک باقاعدہ سوانح عمری ہے۔ جب اس نے پانی پت کی لڑائی جیت لی اور دہلی سے ہوتا ہوا آگرے کے قلعے میں پہنچا تو بابر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ کہ تمام ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی ہے۔ اگرچہ آگرہ اس وقت ہندوستان کا دارالخلافہ اور بادشاہ کا مقام تھا۔ مگر خدا کی شان دہلی کی اہمیت اس قدر ہے کہ بابر دہلی کو صاف دارالسلطنت لکھتا ہے۔ اور آگرے کے نام تک کا ذکر نہیں لودھی بادشاہ آگرے کے قلعے میں رہتے تھے۔ اب بابر نے اسے جائے رہائش بنایا۔ مگر دارالسلطنت پوچھو تو دہلی۔

بابر کے زمانے میں قطب کے قریب کی مسجد درگاہ مولنا جمالی وکمالی تعمیر ہوئی۔ جمالی مسجد کا گاؤں اتنا ہی قدیم ہے جتنا لال کوٹ۔ یہ شیخ فضل اللہ عرف جلال خاں کی قبر کے متعلق ہے مشہور شاعر ہوا ہے تخلص جمالی تھا ۱۵۳۵ء میں وفات ہوئی۔ مقبرہ رنگدار ٹائیلوں سے خوشنما بنا ہوا ہے۔

بابر کا بیٹا ہمایوں ۱۵۳۰ء میں تخت پر بیٹھا۔ نام ہمایوں (مبارک) تھا مگر قسمت نے بڑے نشیب وفراز دکھائے۔ اس کا بھی پایہ تخت آگرہ تھا۔ پھر بھی دہلی میں قطب صاحب کے مقام پر اس نے مربع شکل کی درگاہ امام ضامن تعمیر کرائی۔ جو علائی دروازہ کے باہر واقع ہے۔ آپ کا نام محمد علی مشہدی ہے

طوس ملکِ ایران سے تشریف لائے تھے ۱۳۵۷ء میں وصال ہُوا۔

جب ہمایوں بہار میں شیر خاں سے جو بعد میں شیر شاہ سوری بنا، مصروفِ پیکار تھا۔ تو کچھ عرصے کے لئے اس کا بھائی ہندال دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا۔ مگر ہمایوں کے واپس آنے پر اس نے دہلی چھوڑ دی اور آگرے چلا گیا۔ ہمایوں نے پرانا قلعہ درست کرایا فصیل نئی بنوائی اور اس کی مرمت کرائی۔ گویا اسے نئے سرے سے بنا دیا۔ "دین پناہ" نام رکھا۔ شیر شاہ نے بعد میں اسکو اور مضبوط کر کے اس تعمیر کو مکمل کر دیا۔ اب بھی اس کی دیواریں اس حالت میں ہیں کہ ان سے گذشتہ عظمت کا اندازہ کیا جا سکے۔

ہندوستان کی سلطنت کے لئے شیر خاں اور ہمایوں کی جنگ ہوئی۔ ہمایوں بھاگ کر دہلی آیا مگر ٹھہر نہ سکا۔ سندھ کے ریگستانوں میں عرصے تک بے خانماں خاک چھانتا پھرا۔ اس صحرانوردی میں اس نے ایک ایرانی خاتون حمیدہ بانو بیگم سے شادی کی اور امرکوٹ کے مقام پر ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء میں اکبر پیدا ہُوا شیر خاں نے دانشمندی اور حکمتِ عملی سے ہمایوں کو ہندوستان سے بھگا دیا وہ ایران میں جا کر پناہ گزیں ہُوا، اکبر اپنے چچا کی سپردگی میں پیچھے رہ گیا۔ اب سلطنت کا مالک شیر خاں تھا۔ چونکہ اس کا تعلق پٹھانوں کے سور فرقے سے تھا اس لئے بادشاہوں کا وہ سلسلہ جس کا بانی شیر خاں ہُوا خاندانِ سوری کہلاتا ہے۔ اس میں چھ بادشاہ ہوئے اور انہوں نے پندرہ برس تک

حکومت کی۔

شیر خاں نے جس کا اصلی نام فرید خاں تھا، شیر شاہ کا لقب اختیار کیا اور ۱۵۴۰ء میں تخت پر قابض ہوا۔ یہ بادشاہ بڑا دانشمند اور جوانمرد تھا اس نے پہلے پہل اراضی بندوبست جاری کیا۔ رعایا کی آسائش اور انصاف کا اسے بڑا خیال تھا۔ اس نے بنگالے سے پنجاب تک اور مالوے سے آگرے تک پختہ سڑک بنوائی۔ دو طرفہ درخت لگوائے ہر کوس پہ ایک کنواں تھا۔ دس کوس پر کارواں سرائے۔

گو شیر خاں کا دارالسلطنت آگرہ تھا لیکن دہلی اپنا خراجِ تحسین اور توجہ شاہانہ لئے بغیر نہ رہی۔ پرانے قلعے میں مسجد بنوائی جو اب تک بہت اچھی حالت میں ہے۔ یہ مسجد دورِ افغانی کی آخری عمارتوں میں سے بڑے پایہ کی عمارت ہے۔ اس کے قریب برج کی شکل کا ایک "شیر منڈل" بنوایا۔ یہ بھی اچھی حالت میں ہے۔ شیر منڈل ہشت پہلو دو منزلہ عمارت ہے جس کے اوپر ایک بڑی بُرجی بنی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کبھی اس میں کتب خانہ تھا۔ اس نے کوس منار تعمیر کرائے۔ اس کے عہد میں خلیل اللہ خاں نے درگاہِ قطب صاحب (خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی) تعمیر کرائی جو قطب مینار کے قریب واقع ہے جس کے سبب سے یہ مقام قطب صاحب کہلاتا ہے۔ شیر شاہ نے پرانے قلعے کی فصیلوں میں بہت ردّ و بدل کیا اور قلعے کو بہت مستحکم کر دیا۔ ایک نئی

فصیل شہر کے گرد بنائی جس میں پرانا قلعہ بھی آگیا (نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ) چونکہ
اس وقت آبادی اسی علاقے میں تھی، شہر تو نیا نہیں بسایا مگر شہر پناہ حفاظت
کے لئے بنادی۔ اس کی نشانی فیروز شاہ کے کوٹلے کے سامنے کا لال دروازہ
اب بھی باقی ہے۔ اس شہر کا غربی دروازہ پرانے قلعے کے سامنے "خیر المنازل"
کے پاس اب بھی موجود ہے۔ ایک اور دروازہ اسی شکل و شباہت کا پرانے
قلعے سے ہمایوں کے مقبرے کو جاتے ہوئے سڑک کے دائیں جانب اکیلا
کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ بھی غالباً اسی شہر کا ہے۔

قضا نے شیر شاہ کو یہ تمام کام ختم کرنے کی مہلت نہ دی۔ شیر شاہ کا
زیادہ وقت مالوے کی فتوحات میں گذرا۔ کالنجر کے قلعے کی خندق میں
بارود کے دھماکے سے جاں بحق ہوا۔ اس کا مقبرہ اپنی ابتدائی ریاست
کے دارالخلافے، شہسرام علاقہ بنگال میں ہے اور پرانی عمارتوں
میں بےنظیر ہے ؎

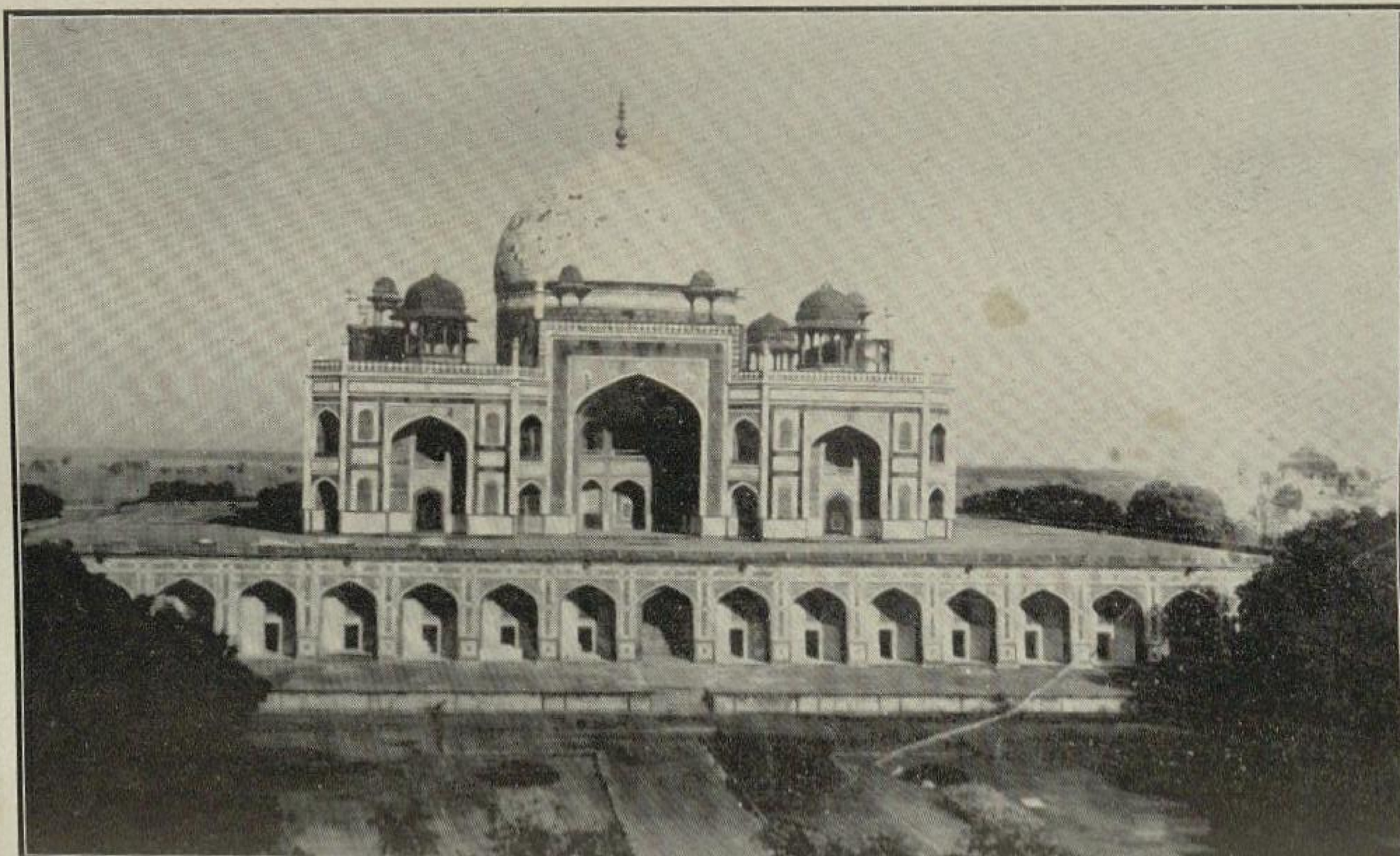
کیونکر نہ غم ہو خلق کو مومن کی مرگ کا!
تھا سب کو اس کی ذاتِ سراپا ہنر سے فیض
مومن

شیر شاہ کے حادثے کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا جلال خاں اسلام شاہ کا
لقب اختیار کر کے ۱۵۴۵ء میں تخت پر بیٹھا۔ یہ سلیم شاہ کے نام سے بھی مشہور
ہے۔ اس نے بھی رعایا کی بہبودی کے بہت کام کئے لیکن تمام عمر لڑائیوں

میں گذار دی۔ شیر شاہی سراؤں کے بیچ کا فاصلہ زیادہ سمجھ کر ان کے درمیان میں ایک ایک اور سرائے بنوائی۔

دار السلطنت آگرہ تھا مگر دہلی سے کسی طرح توجہ کم نہ تھی۔ پرانے قلعے کی فصیل پر چونے کی پختہ بنوائی۔ ایک قلعہ سلیم گڈھ ۱۵۴۶ء میں دریائے جمنا کے بیچ میں ایک چٹان کے اوپر بنایا جو اب بھی لال قلعے کے کونے پر موجود ہے۔ اب اسکے اوپر سے ریل گذرتی ہے۔ اس میں کوئی قابلِ دید عمارت نہیں صرف فوجی حصار ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ اس لئے قابلِ توجہ ہے کہ کسی زمانے میں یہ شہزادوں کا جیل خانہ تھا۔ چونکہ اس کے چاروں گرد پانی تھا۔ جہانگیر نے ایک پل خشکی سے اوپر آنے جانے کے لئے بنایا تھا۔ شاہجہاں نے اسی پل کو لال قلعہ اور سلیم گڈھ کے درمیان کا راستہ بنادیا چونکہ یہ ریل کی پٹڑی کے قریب تھا عہد انگریزی میں اسے توڑ کر ایک نیا پل ذرا فاصلے پر بنایا گیا۔ اس سلسلے میں قلعہ معلےٰ کا ایک کونہ بھی صاف کر دیا گیا سلیم گڈھ کی تعمیر سے ایسا قلعہ بنانا مقصود تھا جو فتح نہ ہو سکے۔ اسلام شاہ کے عہد میں عیسیٰ خاں کا مقبرہ اور مسجد بنے جو ہمایوں کے مقبرے کے قریب واقع ہیں۔

سلیم شاہ نے ۱۵۵۴ء میں انتقال کیا وصیت کے موافق اس کا بارہ برس کا لڑکا تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن اپنے ماموں کے ہاتھوں صرف تین



حجام کا مقبرہ ☜

مقبرہ میاں فہیم ☜

مقبرہ ھمایوں

دن کے بعد قتل ہُوا۔

ماہیم کہ از عرش بزیر آمدہ ایم در فتنۂ منکر و نکیر آمدہ ایم
جا گوہم نہ کردہ ایم محمل بستیم مازود برفتہ ایم و دیر آمدہ ایم گرامی

قاتل مبارز خاں نے محمد عادل شاہ کا لقب اختیار کیا اور تخت پر بیٹھا۔ ع برعکس نہند نام زنگی کافور۔ بالکل لایعنی سا آدمی تھا۔ اس کا ایک ہندو وزیر ریواڑی کا بقال ہیمو نامی تھا۔ کوئی دو سال کے بعد اس کے بہنوئی ابراہیم سور نے دہلی اور آگرے پر جبراً قبضہ کر لیا۔ عادل شاہ اور اس کا وزیر بنگال کو بھاگ گئے۔ ابراہیم کو تخت پر بیٹھے صرف دو مہینے گذرے تھے کہ محمد عادل شاہ کے بھانجے پنجاب کے حاکم سکندر شاہ نے آگرے کے قریب مقام فرح پر اس کو شکست دی اور ۱۵۵۴ء میں خود تخت پر بیٹھا سکندر خاں کا اصلی نام احمد خاں تھا۔ اس طرح چند مہینوں میں چار بادشاہوں کی تاجپوشی ہو چکی تھی جن میں سے تین زندہ اور تخت کے دعویدار تھے۔ آپس کی لڑائی یقینی ہے۔ ہمایوں نے، جو ایران میں منتظر تھا۔ موقع غنیمت جانا۔

اسی سال ہمایوں ایران سے واپس آیا، وہ ہندوستان کے تمام حالات سن چکا تھا۔ اس نے سکندر شاہ سور کو سرہند کے مقام پر شکست دی، وہ پہاڑوں میں بھاگ گیا جب گھر میں اتفاق نہ ہو تو باہر والوں کا مقابلہ

کس طرح ہو۔ وہاں تو ایک کی جان کا ایک دشمن ہو رہا تھا۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ؎

قطرہ قطرہ بہم شود دریا دانہ دانہ بہم شود انبار

سوریوں کی سلطنت کے ساتھ، طرزِ تعمیر کا افغانی دور بھی ختم ہو گیا خاندانِ سوری سے پہلے بابر اور ہمایوں نے ۱۴ سال کے عرصے میں پرانی طرز کو کچھ بدل کر عمارتوں کو بنانا شروع کیا تھا۔ گو یہ نئی طرز ابھی بہت ابتدائی حالت میں تھی مگر نقشہ میں اختلاف ظاہر تھا۔ شیر شاہ نے اس نئی طرز کی طرف توجہ نہ دی۔ چونکہ خود افغان تھا اپنی افغانی دور کی بناوٹ کی عمارتیں بنواتا رہا۔ اسطرح دورِ افغانی کا نقشہ مغلوں کے اوائل عہد تک قائم رہا۔

طرزِ تعمیر کا افغانی دور سیدوں کے عہد سے شروع ہوا اور لودھیوں نے اسے تکمیل تک پہنچایا یہ عمارتیں بہت نستعلیق اور دلپسند ہیں مسلمانوں کی حکومت جم چکی تھی۔ ملک میں پہلے سے زیادہ امن و امان تھا آسائش کے سبب تمدن کی ترقی کا احتمال زیادہ تھا۔ اثر تو پہلے سے ہو رہا تھا مگر انہوں نے پہلے کی نسبت، ہندوانی طرز کی تفصیلات کا زیادہ استعمال کیا۔ ہندو نقش و نگار اور بناوٹ نے اسلامی نمونوں پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ دونوں کا پیوند بڑی عقلمندی سے لگایا گیا لیکن وہ سادہ مرعوب کن اور بلند بناوٹ قائم رہی۔

اس طرح مختلف شکلوں کی برجیوں اور نقوش کا استعمال زیادہ ہوگیا نوکدار محراب کی شکل بھی بدل دی گئی۔ کونوں پر چھوٹے قد کے مینار بننے شروع ہوئے۔ دروازے کی پیشانی کی سل جسے واسہ کہتے ہیں۔ محراب کے نیچے دروازے میں داخل کردی گئی۔ اس کے بعد طاق بھی نقش ونگار کے ساتھ دونوں طرف بڑھا دیے گئے تغلقی عہد کی طرح بعض عمارتوں کی دیواریں ڈھلوان ہیں چھت کے قریب دیواروں کے باہر کی طرف چھجا لگایا گیا۔ پہلوؤں کے کونوں پر برجیاں بنائی گئیں سنگِ سرخ، سنگِ مرمر اور رنگدار روغنی اینٹوں کا استعمال شروع ہوا۔ گنبدوں کے گرد ہالا بنایا گیا اوپر پتھر کی چوٹی لگائی گئی۔ اسے اکثر اوقات تراش کر کنول کی شکل کا بنایا جاتا تھا۔ گنبد کی دیواروں کو اندر کی طرف جھکانے سے پہلے چھت سے کافی اونچا کر لیا جاتا تھا جس سے گنبد اوپر اٹھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ تجربہ اور عمل سے عمارات کے مختلف حصوں کا تناسب اور ان کی اشتراکی نشست بھی بہتر ہو گئی۔ اس عہد کی بنی ہوئی کئی قبریں اور عمارات اس سڑک پر واقع ہیں جو قطب کی سڑک سے پھٹ کر حوض خاص کو جاتی ہے۔

مقبرہ بہلول لودھی روشن چراغ کے قریب جہاں پناہ میں واقع ہے۔ اسکے بارہ دروازے اور پانچ گنبد ہیں۔ گرد کا باغ تباہ ہو چکا ہے۔ اب وہاں وسیع قبرستان ہے۔ شیخ یوسف قتال کی درگاہ موضع کھڑکی کے

قریب شمال میں واقع ہے۔ ۱۵۰۰ء کے قریب بنی۔ آپ قاضی جلال الدین لاہوری کے مرید تھے۔ بارہ کھمبوں کے اوپر ایک چھوٹا گنبد بنایا گیا ہے اور دیواروں کو سُرخ پتھر کی جالیوں سے مکمل کیا گیا ہے۔ چھجّے کو اسطرح تراشا ہے کہ روغنی اینٹیں معلوم ہوتی ہیں۔ کنس پہ رنگدار ٹائلیں ہیں۔ ایک منہدم مسجد قریب ہی واقع ہے۔ اس کے قریب شمال میں درگاہ کبیر الدین اولیا ہے۔ یہ مقبرہ بہلول لودھی سے آدھ میل مغرب کی جانب واقع ہے اس کو لال گنبد بھی کہتے ہیں۔ آپ یوسف قتال کے فرزند تھے۔ یہ مقبرہ سُرخ پتھر اور سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ غیاث الدین تغلق کی طرح قبر کی دیواریں ڈھلوان ہیں۔

مقبرہ ہمایوں کے قریب عیسیٰ خاں کا مقبرہ اس عہد کی بہت خوبصورت عمارت ہے۔ اوپر کثیر التعداد برجیاں اور ہندوانہ طرز کی چوٹیاں اور منارے ہیں۔ پتھروں کی جالیاں ہیں پلستر میں تراش کی گئی ہے۔ رنگدار روغنی اینٹوں کا استعمال بہت اچھی طرح کیا گیا ہے۔ گنبد کے اوپر پتھر کے تراشیدہ کلس کے سر پہ ایک اور پتھر کی چوٹی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قلعہ کہنہ کی شیر شاہی مسجد اُن تمام مسجدوں سے جو اس سے پہلے بن چکی تھیں نقش و نگار اور نفاست کے لحاظ سے بہتر ہے۔ سنگِ موسٰے اور مرمر کا جائز استعمال کیا گیا ہے۔ روغنی رنگدار اینٹیں بھی لگائی گئی ہیں۔ دیواروں پر خوبصورت طاق بنے ہوئے

ہیں اوپر مخروطی برج بھی ہیں۔

پندرہ برس برطرف رہنے کے بعد ہمایوں نے پھر ہندوستان کے تخت پر قبضہ کیا۔ ۲ جولائی ۱۵۵۵ء کو دہلی آیا اور قلعہ سلیم گڑھ میں تین دن تک رہا۔ ہندوستان سے بھاگنے سے پہلے جب ہمایوں کی شیر شاہ سے جونپور کے قریب علاقہ بنگال میں جنگ ہوئی تو ہمایوں کا تمام لشکر تتر بتر ہو گیا پیچھے دشمن کی تلواریں تھیں، سامنے گنگا دریا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اللہ کا نام لے گھوڑا دریا میں۔ رو تیز تھی منجدھار میں گھوڑا تھک کر ڈوب گیا۔ قریب تھا کہ خود بھی بہہ جائے۔ نظام سقا کہیں مشک پھلائے چھاتی تلے دبائے۔ بہاؤ پر چلا جاتا تھا مرصع کلغی سے پہچانا۔ جہاں پناہ کو سہارا دیا اور دوسرے پار پہنچایا۔ وعدہ ہوا کہ آدھے دن کی بادشاہت اس کے صلے میں۔

جب ہمایوں کو قادرِ مطلق نے پھر تخت بخشا تو نظام سقا بھی آدھمکا۔ ہمایوں کو وعدہ یاد آ گیا۔ تخت سے اُترا اسے مسند پر بٹھا دیا۔

مکن وعدہ اگر کردی وفا کن ۔۔۔ طریقِ بے وفائی را رہا کن ۔۔۔ جامی

اس آدھے دن کی بادشاہی میں سقے نے مشک کاٹ کر چمڑے کے روپے چلائے۔ امراء سے نذرانے تحفے وصول کئے۔ اپنے عزیز و اقارب کو جاگیریں اور انعام بخشے۔ دریا دل ہمایوں کے زبان کے احترام، اور سخاوت کی ادنیٰ مثال۔ واہ! کیا لوگ تھے۔ اتنی سی بات میں ہمایوں کا کیا بگڑ گیا وہ بادشاہ

تھے بنئے بقال نہ تھے۔

ناصر الدین ہمایوں کی عمر نے وفا نہ کی۔ ۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء کو شیر منڈل واقع پرانا قلعہ کی سیڑھیوں سے گر کر ۵۱ سال کی عمر میں راہیٔ ملکِ بقا ہوا تاریخ ہوئی "ہمایوں بادشاہ از بام افتاد" لیکن اس میں ایک عدد کم رہتا ہے صحیح سن "وارثِ ملک جلال الدین باد" سے ۹۶۳ھ نکلتا ہے ہمایوں نے باپ کی وصیت پلے باندھ لی تھی۔ ہر موقع پر بھائیوں سے مہربانی کی۔ مگر ہمیشہ نقصان اٹھایا ہر ایک بات اندازے سے ہونی چاہئیے۔ بدکردار پہ مہربانی کرنا گویا اسے اجازت دینا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں نامۂ اعمال اور سیاہ کرلے۔

نکوئی بابداں کردن چناں است   کہ بد کردن بجائے نیک مرداں سعدی

بھائیوں سے پہلے بھی کئی معرکے ہوئے تھے ایران سے واپس آکر ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کو کابل میں شکست دی اور تنگ آکر مجبور ہوا کہ اسکی آنکھوں میں نشتر لگا کر اسے اندھا کر دیا جائے۔

ہمایوں علم جفر اور نجوم کا بڑا ماہر تھا اس نے سیاروں کی مناسبت سے ایک محل بنوایا سیاروں کے رنگوں کے مطابق ایک دائرے میں اسکے چاروں گرد کمرے تھے اور انہیں سے نامزد تھے۔ ان کمروں میں گردش کے حساب سے دربار ہوتا تھا۔ ہمایوں ایک شام زہرہ کا طلوع دیکھنے شیر منڈل پہ چڑھا غالباً قرانُ السعدین تھا۔ اترتے وقت، مؤذن نے قریب کی مسجد سے مغرب کی

آذان کی صدا بلند کی۔ بغرضِ تحریم بیٹھ گیا۔ سہارا لیکر اٹھنا چاہا مگر عصا سیڑھی پر سے پھسلا اور خود بھی ساتھ لڑھک کر نیچے آرہا۔ کنپٹی پر سخت چوٹ آئی۔ یہی موت کا بہانہ ہوُا۔

ہمایوں کا مقبرہ اکبر کی ماں نواب حاجی بیگم (حمیدہ بانو بیگم ملقب بہ مریم مکانی) نے ۱۵۵۶ء سے ۱۵۶۵ء میں بنوایا۔ اس میں اکبر کی جیبِ خاص کا زیادہ روپیہ صرف ہوُا۔ مریم مکانی بھی یہیں اسی مقبرے کے کونے میں دفن ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ مقام بڑا دلخراش ہے۔ یہاں پر اور کئی تیموری شہزادوں اور بادشاہوں کی قبریں ہیں۔ مثلاً دارا شکوہ اورنگ زیب کا سب سے بڑا بھائی شہنشاہ جہاندار شاہ۔ عالمگیر ثانی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مقبرہ شاہی خاندان کا قبرستان بن گیا جس کو جگہ نہ ملی جدّ امجد کے زیرِ سایہ لاکر لٹا دیا۔ اسی جگہ غدر کے زمانے میں بادشاہ بہادر شاہ گرفتار ہوئے تھے۔ یہ پہلا مقبرہ ہے جو اس طرز کا بنا۔ اس کی سادگی اور عظمت قابلِ ستائش ہے یہ بناوٹ اس قدر مقبول ہوئی کہ بعد میں مغلوں کے اکثر مقبرے اسی طرز پر بنتے رہے چنانچہ آگرے کا تاج محل بھی اسی کی روش پر ہے۔

نواب حاجی بیگم بطور تبرک عرب سے مختلف طبقوں کے لوگوں کا ایک کثیر التعداد گروہ اپنے ساتھ لائی۔ ان کے لئے ۱۵۶۰ء میں ایک الگ مقام ہمایوں کے مقبرے سے ملحق بسایا "عرب سرائے" نام رکھا اور انکو وہاں آباد

گیا۔ اس وقت یہاں پر آبادی گنجان اور بڑے رقبے میں ہو گی چونکہ اس احاطے میں عہد اکبری میں بہت سی عمارات بنائی گئیں عرب سرائے کی چاردیواری اچھی حالت میں ہے۔ اور اس میں ایک گاؤں بستا ہے۔

ہمایوں کے بعد اس کا بیٹا ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر ۱۳ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا جو اکبر اعظم مشہور ہوا۔ اسے اوائل میں بڑی دقتوں کا سامنا ہوا عادل شاہ کا وزیر ہیمو بقال دہلی اور آگرے پر قابض ہو گیا۔ تھا تو عقل کا ٹوکرا مگر قسمت نے ہار دی۔ پانی پت کے میدان پر ۱۵۵۶ء میں لشکر سامنے ہوئے ہیمو بڑی کامیابی سے میدان کارزار کو سنبھال رہا تھا کہ اس کی آنکھ میں ایک ناگہانی تیر لگا۔ فوج بھاگ گئی۔ ہیمو پکڑا گیا اور قتل ہوا۔ واہ رے اکبر تیرا اقبال شروع میں بیرم خاں اتالیق تھا اٹھارہ سال کی عمر میں حکومت کی باگ اس نے اپنے ہاتھ میں لی۔

اکبر نے بہت فتوحات کیں اور سلطنت کو بڑھایا۔ بہت سی مفید باتوں کو رواج دیا۔ عرصۂ سلطنت پچاس برس ہے۔ کہنے کو دارالسلطنت آگرہ تھا مگر دہلی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ گذشتہ تمام مہموں میں ہندوستان کے تخت کا مالک بننے کے لئے آگرے کی نسبت دہلی کو فتح کرنا زیادہ ضروری تھا۔

اکبر نے خود تو فتح پور سیکری میں عظیم الشان محلات کا ایک شہر بسا دیا۔ اس کے عہد میں دہلی کے خطے میں بہت سی عمارات بنیں، چونکہ راجپوتوں سے

مراسم گہرے تھے اسے آگرہ زیادہ دلپسند تھا۔ ہمایوں کے رفقا چونکہ دہلی میں بس چکے تھے۔ اس لئے یہیں رہے اور دفن ہوئے۔ اکبر کی رضائی ماں کا نام "ماہم انگہ"۔ انگہ ترکی میں انا یا دودھ پلانے والی کو کہتے ہیں۔ اس کا بیٹا ادھم خاں تھا اور اس لئے اکبر کا دودھ شریک بھائی سلطنت میں بڑا دخیل اور معتمد جرنیل تھا۔ اکبر ماہم انگہ سے ملنے اکثر دہلی آیا کرتا تھا۔ ادھم خاں نے کئی بدعنوانیاں کیں۔ آخری یہ کہ تگہ خاں کو آتش حسد کے سبب عین دربار میں قتل کر دیا۔ تگہ خاں الملقب بہ خانِ اعظم شمس الدین محمد خاں، اکبر کی دوسری رضاعی ماں کا خاوند اور دانشمند وزیر تھا جس پر بادشاہ کو بہت بھروسہ تھا۔ اکبر نے ادھم خاں کو چھت پر سے گروا کر مروا ڈالا۔ اس کا مقبرہ قطب صاحب کے قرب میں واقع ہے اسکو "بھول بھلیاں" کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ جو اندر جاتا ہے باہر آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسلئے "بھول بھلیاں" بھی کہلاتا ہے۔ اب اسے بند کر دیا گیا ہے۔ تھوڑے عرصے میں ماہم انگہ جواناں مرگ بیٹے کے غم میں گھل گھل کر دنیا سے چل بسی اور اسی مقبرے میں دفن ہوئی ؎

اولاد کا ہونا بھی بڑی بخشش رب ہے
یہ سچ ہے مگر داغ بھی بیٹے کا غضب ہے — میر انیس

خانِ اعظم تگہ خاں کا مقبرہ اس کے بیٹے نے نظام الدین صاحب کے

قریب عہدِ اکبری میں بنوایا تھا۔ اور اب بھی موجود ہے۔ اس میں تین قبریں ہیں اس کی اپنی، بیوی اور بھائی کی۔ مرزا عزیز کوکلتاش، وزیرِ سلطنت خانِ اعظم کا بیٹا تھا اور اس لئے بادشاہ کا رضاعی بھائی ہؤا۔ کوکلتاش ترکی میں رضائی بھائی کو کہتے ہیں۔ اس کو یکے بعد دیگرے احمد آباد، گجرات، مالوے کی صوبہ داری تفویض ہوئی تھی۔ حضور کی طرف سے ذاتی جاگیرات اور مناصب بھی ملے ہوئے تھے۔ عہدِ جہانگیری میں مرزا عزیز پر عتابِ شاہی نازل ہؤا مگر پھر جاگیریں بحال ہوگئیں۔ ۸۵ برس کی عمر میں ۱۶۲۴ء میں فوت ہؤا اور حضرت نظام الدین کی درگاہ کے قریب سنگ مرمر کی بنی ہوئی صفا عمارت، چونسٹھ کھمبے میں آسودہ ہے۔ جو اپنی شان کی ایک عمارت ہے اور اس کے چونسٹھ کھمبے ہیں۔

بیرم خاں ہمایوں کا مصاحب اور جرنیل تھا۔ بعد میں اکبر کا اتالیق مقرر ہؤا اس کا بیٹا عبد الرحیم خاں، خانِ خاناں سلطنت کا بڑا معتمد وزیر تھا سخاوت اور فضیلت میں چار وانگ عالم میں شہرہ حاصل کیا۔ اس کا مقبرہ اس سڑک پر واقع ہے جو ہمایوں کے مقبرے سے اوکھلے کو جاتی ہے۔ اسکی بنا مرحوم نے خود ڈالی تھی۔ شاہجہان کے عہد میں تیار ہؤا۔ اب بہت خستہ اور قابلِ رحم حالت میں ہے پتھر اتار کر ننگا بچا کر دیا ہے۔

اکبر کے عہد میں ہمایوں کے مقبرے کے نزدیک کا حجام کا مقبرہ تیار ہوا جو اس کی چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ پرانے قلعے کے مغربی دروازے



شاہجہاں بانئی تاج محل آگرہ

بعنایت ٹرسٹیز پرنس آف ویلز میوزیم آف ویسٹرن انڈیا بمبئی

کے سامنے ایک دروازہ اور عمارت کھڑی ہے۔ دروازہ توشیر شاہی شہر کا غربی دروازہ ہے۔ عہدِ اکبری میں یہاں پر اکبر کی رضاعی ماں ماہم انگہ نے ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا "خیر المنازل" نام ہوا لیکن ماہم انگہ کا مدرسہ کہلایا۔ مسجد کے اندر اور باہر نقش و نگار اور رنگین استر کاری بافراط کی ہوئی تھی۔ خوشنما پھول پتے مختلف رنگوں میں بنائے گئے تھے لیکن زمانے نے خستہ کر دیا۔ مدرسہ گر گیا ہے۔ اس کے ملحقہ حجرے اور مسجد باقی ہے۔

اکبر ۱۵۶۳ء میں دہلی آیا۔ جب ماہم انگہ کے مدرسے کے سامنے سے شاہی سواری جا رہی تھی، ایک باغی امیر کے غلام نے دھوکا دیکر تیر مارا جو بادشاہ کے شانے میں بیٹھا مگر یہ شکر ہوا کہ تیر زہر میں بجھا ہوا نہ تھا۔ زخم جلدی اچھا ہو گیا۔

اکبر کو کابل اور شمالی ہند کے دیگر حصوں کی فتوحات کی غرض سے پنجاب میں رہنا پڑا۔ اس عرصے میں ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۵ء تک لاہور کا شہر شاہی احکام اور درباری معتمدوں کا مقام رہا۔ اکبر کا اصلی دارالسلطنت آگرہ تھا۔ وہاں اس نے صرف کثیر سے بے انتہا محل اور عالیشان عمارتیں بنائیں جو قابل دید ہیں۔ اکبر اعظم شہنشاہ ہند اب آگرے سے تین میل کے فاصلے پر سکندرہ میں خاموش پڑا ہے جہاں وہ شان و شکوہ سے بالکل بے نیاز ہے۔ عمارت بہت شاندار ہے مگر زائرین کے سوا وہاں کوئی نہیں پھٹکتا۔ تاریخ ہوئی "فوت اکبر شہ" ۱۰۱۴ھ

اکبر قطعاً ان پڑھ تھا مگر فضل و کمال کا متجسس۔ اس نے اپنے گرد شمعِ علم و ہنر کے بہت سے پروانے جمع کیے جن میں سے سربرآوردہ تو اکبری نو رتن کہلاتے ہیں۔ ہر ایک فضیلت اور کمالیت کے لحاظ سے اپنے فن کا استادِ دوراں تھا۔ بچپن میں باپ سے جدا رہنے کے سبب جائز تربیت سے محروم رہا۔ اس کا اثر تا دمِ حیات قائم تھا۔ خداداد حشمت و اقبال کا مالک تھا۔ راہِ دشوار سے ہراساں معاملہ سنج دماغ، موقع پہچان کر مناسب روپ دھار لیتا تھا۔ ایک مذہب "دین الٰہی" رائج کیا۔ خود اس کا پیشوا بنا۔ ذو معنی اللہ اکبر کو بہت رواج دیا۔ سورج اور بادشاہ کے درشن اس کے اصولوں کا جزوِ اعظم تھا۔ مہابلی ایشور کے اوتار تھے۔ ایک ذرا سا ہیچ ہی تو ہے ؎

از منزلِ کفر تا بدیں یک نفس است　　　وز عالم شک تا بہ یقیں یک نفس است
ایں یک نفسِ عزیز را خوش مے دار　　　کز حاصلِ عمر ما ہمیں یک نفس است

عمر خیام

اوائل میں بیرم خاں کا دم نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ سِن رسیدہ، زمانہ چشیدہ اتالیق، ہونہار نوخیز کو سنبھال گیا۔

اکبر کے عہد سے مغلِ اعظم شہنشاہِ ہند، کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہو گیا۔ دہلی اور آگرہ شاہی شان و شوکت کے مرکز تھے۔ اس دربار میں موتیوں کے مینہ برستے تھے۔ زمین ہیرے اگلتی تھی۔ زمین سے آسمان تک اطلس و

کمخواب کی آرائش تھی۔ در و دیوار سونے روپے کے بنے ہوئے تھے کھڑکیوں اور دروازوں سے جواہرات لٹکتے تھے لعل و زمرد کے انبار سڑکوں پر لٹتے تھے۔ تمام عالم ہندوستاں کی دولت کی تعریف میں رطب اللّساں تھا۔ ہندوستان سونے کی چڑیا تھی۔ کیمیا کے حریص یورپ تک سے کھچے چلے آئے تھے۔

شہزادہ سلیم اکبر کی وفات پر اکتوبر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا اور نورالدین جہانگیر کہلایا۔ جہانگیر نے سلطنت میں اضافے کئے اور قوانین میں اصلاح کی جہانگیر کی ملکہ نورجہاں حسن و خوبی کے سبب شہرہ آفاق ہے۔ یہ قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ حسن و عشق کا مکمل افسانہ ہے

نورجہاں گرچہ بظاہر زن است　　　در صفِ مرداں زنِ شیرافگن است

اب نہ نورجہاں باقی ہے نہ جہانگیر، فقط ناموں پہ دھبا رہ گیا ہے۔ ملکہ کا نام بادشاہ کے ساتھ سکے پر مضروب کیا جاتا تھا۔ فرامین پر خود دستخط کرتی تھی۔ جہانگیر سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ نورجہاں قابلِ تعریف دل و دماغ کی مالک تھی بسر پر تاج پہنتی شیر کا شکار، تیر اور بندوق سے کرتی تھی۔ شاعرہ تھی۔ اس کے مجوزہ زیورات اور لباس کے تراش کی وضع بہت مقبول ہوئی۔ گلاب کا عطر اس کی ایجاد ہے۔

نورالدین خود کہا کرتا تھا۔ "ما سلطنت را بہ نورجہاں بیک پیالۂ شراب

و دو سیخ کباب فرو ختیم" بالکل فنا تھا جس پر جہانگیر جیسا رمز شناس اور نقطہ رس مغل شہنشاہ جان دیتا تھا، آخر کچھ بات تو تھی ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرا نمایہ کیا کئے غالبؔ

ہائے کیا یاد آیا۔ چوٹ کہیں لگتی ہے درد یہاں اٹھتا ہے ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دنیا میں کیا کیا نہ تھا اور وہ اس چند روزہ مشتِ خاک کی امانت کو لیکر اپنے آپکو کیا کیا نہ سمجھتے تھے ...... کوئی بکھری ہوئی کاکل۔ صفتِ گیسوئے سنبل کیسی کا چہرہ یہ گل گل کہ اڑے ساتھ ہی بلبل۔ کوئی گوندھے ہوئے پٹی ہمہ تن بیرِ بہوٹی۔ وہ بھنویں دیکھ کے جٹی۔ ہوئی گم حور کی ہٹی۔ کوئی تصویرِ جوانی۔ کوئی طاؤس کا ثانی۔ کوئی یوسف کی نشانی۔ کوئی نقشِ کفِ مانی۔ گل و گلزار کے جھکے۔ پڑے ہیں ڈورے ہوس کے ..... (مصرعہ عشرت) مگر انجام کار وہی .... نہ رہا ہے نہ رہے کچھ۔ گئی ٹر تیغ نریماں۔ گیا اُڑ ناوکِ پیران گیا پھر پنجۂ ساساں۔ ہوا پھر تختِ سلیماں۔ گئے گر قصرِ سکندر۔ گیا گھر لشکرِ نوذر۔ گئی رک نوبتِ سنجر۔ گئی جھک گردنِ بیژر۔ گیا کٹ نیزۂ قارن۔ پڑا پٹ خنجرِ بیژن۔ گئی مٹ نخوتِ ارجن۔ گیا ہٹ رخشِ تہمتن۔ گیا چِن سینۂ سہراب گئی چھن دولتِ داراب۔ گئی ٹر تیغِ کف زاب۔ گیا اڑ رنگِ رخِ شاب

ہیں کہاں کیو جہاں کے۔ ہیں کہاں ریو جہاں کے۔ ہیں کہاں نیو جہاں کے۔ ہیں کہاں دیو جہاں کے۔ نہ سلاطین کی ہے فوں فوں۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ (مصرعہ عبرت) مولنا بیان یزدانی میرٹھی۔

جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں مشہور ہوا، ۱۶۲۳ء میں بغاوت کی۔ آگرے کی فتح کا قصد پہلے دو دفعہ کیا تھا مگر ہزیمت اٹھائی، اب کے دہلی کی طرف بڑھا۔ تغلق آباد کے قریب لشکر مقابل ہوئے۔ شہزادے کا لشکر بکھر گیا اور وہ بھاگ گیا۔

جہانگیر کے عہد میں ہمایوں کے مقبرے کے نزدیک کا نیلا برج (مقبرہ میاں فہیم) تیار ہوا جو اس کی چاردیواری کے باہر واقع ہے میاں فہیم خانِ خاناں عبدالرحیم کا معتبر اہلکار تھا حضرت امیر خسرو کی درگاہ نئے سرے سے بنی۔ سرائے فرید خاں یعنی شہر دہلی کا موجودہ جیل خانہ واقع بیرون دہلی دروازہ، ہمایوں کے مقبرے کے قریب کے نالے کا پل "بارہ پلہ" کوس منار اور مقبرہ شیخ فرید اسکے زمانے کی دیگر یادگاریں ہیں۔ یورپ کے ساتھ اس زمانے میں آمدورفت کا اچھا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ انگلستان کا سفیر سر ٹامس راؤ اسی کے عہد میں ۱۶۱۵ء میں آیا، یہ پہلی سفارت تھی۔

عہدِ جہانگیری میں دہلی، بخارا کے ایک رئیس کے فرزند سید کمال کو بطور جاگیر عطا ہوئی۔ اس کا زیادہ وقت اجمیر میں گذرتا تھا تاہم وہ دہلی میں آتا

رہتا تھا۔ نئی سرائیں بنوائیں۔ ان میں نوکر ملازم رکھے۔ حمام بنوائے ندیوں اور دریاؤں پر پل تیار کئے۔

جہانگیر نے ساٹھ سال کی عمر میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے۔ اکتوبر ۱۶۲۷ء میں انتقال کیا۔ یہ بادشاہ کشمیر کا بڑا دلدادہ تھا اور اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ دریائے راوی کے شمالی کنارے اس کا عالیشان مقبرہ بمقام شاہدرہ لاہور کے قریب ہے۔ تاریخ ہوئی "جہانگیر از جہاں عزم سفر کرد" ۱۰۳۷ھ "مشہور جہانگیر از جہاں رفتہ" ۱۰۳۶ھ مگر اس میں ایک عدد کم رہتا ہے۔ جہانگیر انصاف پرست فنونِ لطیفہ کا حامی صاحبِ دل مغل شہزادہ تھا۔

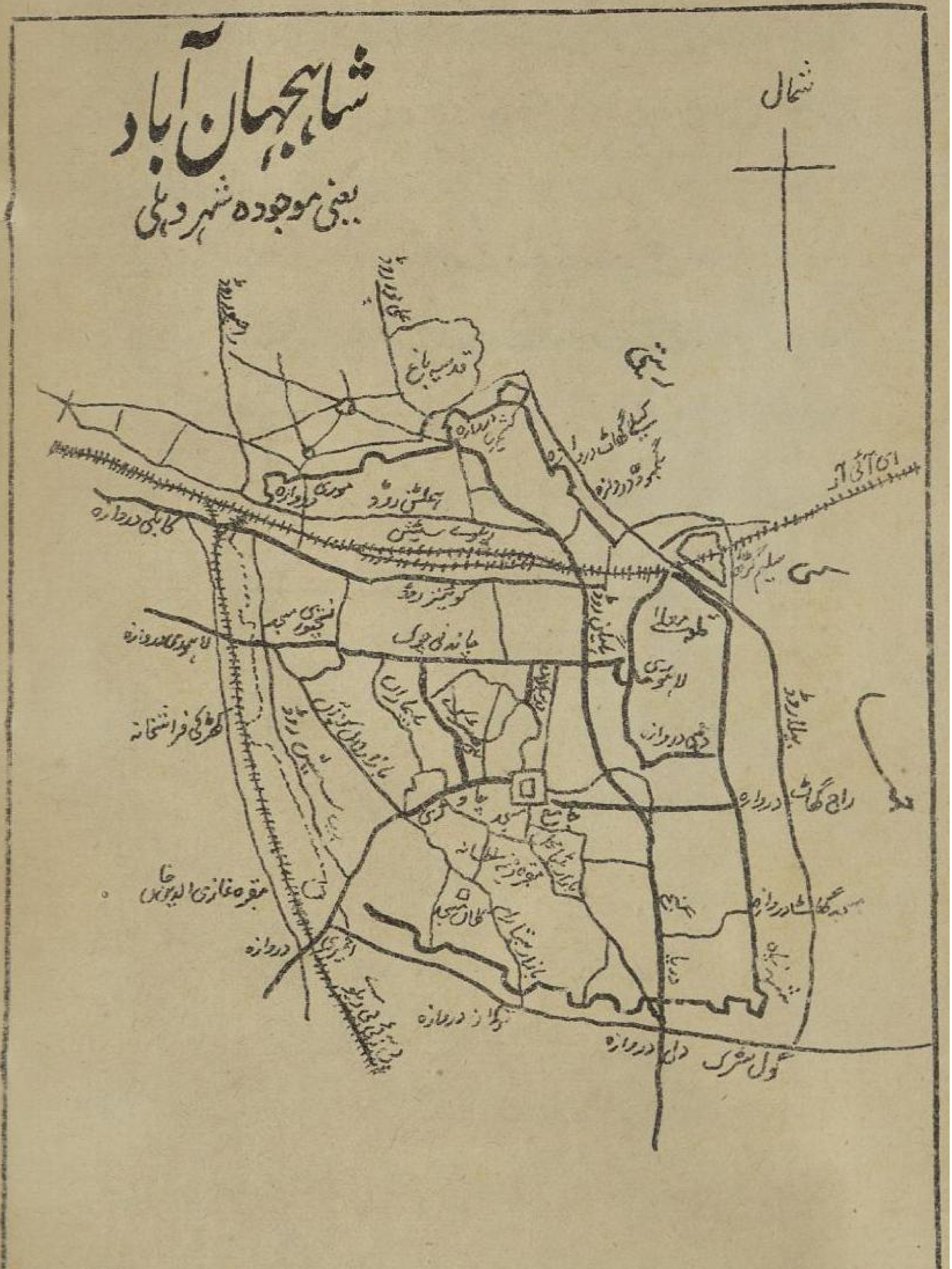
جہانگیر نے مہرالنساء کو حاصل کرنے کے لئے عالم میں آفت برپا کردی تھی مگر رفیقِ زندگی کا ساتھ نہ دے سکا۔ بادشاہ نے ساتھ چھوڑ عزمِ سفر باندھا۔ بیگم نے اٹھارہ سال کا رنڈاپا سفید کپڑوں میں کاٹا عطر زیور تمام ترک کردیا۔ پتا نہیں کسطرح زندہ رہ سکی ہوگی۔ شاید ؎

نادان ہو۔ جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور — غالبؔ

انتقال ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ (۱۷ دسمبر ۱۶۴۵ء) کو ہوا۔ اب تاجدارِ خوبرویانِ ہند، حکمرانِ ہندوستان "نورِ جہاں" جہانگیر کے مقبرے کے قریب لاہور میں آخری نیند سو رہی ہے۔ کبھی قبر دیکھنے کا قصد نہ کرنا، بے ثباتیٔ

عالم سے سینہ شق ہو جائے گا۔ ہندوستان کی ملکہ، نہیں ہندوستان کا بادشاہ۔ اور آخری نشانی کی یہ حالت ہے۔ کہ نورجہان کا اپنا شعر ہی اس پر صادق آتا ہے ؎

برمزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے



شاہجہان آباد
یعنی موجودہ شہر دہلی
شمال
قدسیہ باغ
کشمیری دروازہ
موری دروازہ
کابلی دروازہ
ریلوے سٹیشن
کوئینز روڈ
فتحپوری مسجد
لاہوری دروازہ
چاندنی چوک
لال قلعہ
دہلی دروازہ
راج گھاٹ دروازہ
اجمیری دروازہ
ترکمان دروازہ
گول سڑک
A. Hamid Art.



اورنگ زیب جوانی میں
بغنایت ٹرسٹیز پرنس آف ویلز
میوزیم آف ویسٹرن انڈیا بمبئی

۹- شاہجہاں آباد- دورِ اوّل

جب جہانگیر مرا، اس کا بیٹا شہزادہ خرّم دکن میں تھا بھائیوں میں تخت حاصل کرنیکی "جنگ تصفیہ" ہوئی۔ چند جھڑپوں کے بعد ابوالمظفّر شہاب الدین، شاہجہاں صاحبقرانی ثانی کے نام سے فروری ۱۶۲۸ء میں سریر آرائے سلطنت ہُوا۔ شاہجہاں مغل بادشاہوں میں عمارتوں کے تعمیر کرنے کے لحاظ سے سب سے زیادہ شہرۂ آفاق ہے۔ اس نے ۳۰ برس حکومت کی کئی مسجدیں مقبرے بنوائے شہر آباد کئے۔ "تاج" آگرے کی عمارت جو دنیا کے عجائبات میں سے ہے اس بادشاہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے وزیر علی مردان خان نے جو فنِ تعمیرات میں بڑا ماہر تھا، نہر جمن مغربی پھر کھلوائی جو اب تک باقی ہے۔ اُس وقت نہرِ علی مردان خاں کہلاتی تھی۔ علی مردان خاں کی نہر وہی فیروز شاہی نہر تھی جسے حصار تک بڑھا دیا گیا اور صاف کر کے ۱۸۲۰ء میں پھر جاری کیا گیا۔

شاہجہاں کو تبدیلِ دارالحکومت کا خیال ہُوا۔ اس نے موجودہ دہلی بنوائی۔ "شاہجہاں آباد" نام رکھا اور اس میں لال قلعہ جو بطور محل تھا سرخ پتھر کا بنوایا شاہجہاں آباد کی شہر پناہ میں کبھی چودہ دروازے اور چودہ کھڑکیاں تھیں (نقشہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۶) تمام فصیل پتھر اور چونے سے پختہ بنوائی گئی ہے انگریزوں نے

بھی اس میں معقول اضافے کئے۔ اب اس کا مغربی حصّہ گرادیا گیا ہے۔ جو نقشے میں منقوط دکھایا گیا ہے۔ فصیل ۶۶۶۴ گز لمبی چار گز چوڑی اور نو گز اونچی ہے۔ اس میں تقریباً ۳۰ فٹ اونچے ۲۷ برج ہیں۔ تعمیر کا کام ۱۶۳۶ء سے لیکر دس برس تک جاری رہا۔ فصیل پہلے کچی مٹی کی تھی بعد میں پختہ ۱۶۵۸ء میں بنی۔

دہلی کی قابلِ تعریف جامع مسجد بھی اسی کے زمانے کی بنی ہوئی ہے اور قلعے کے بہت قریب واقع ہے۔ جامع مسجد کی عمارت ۱۶۵۰ء میں شروع ہوئی اور چھ سال میں ختم ہوئی۔ مربع صحن کے پہلو ۴۰۰ فٹ ہیں مینار ۱۳۰ فٹ اونچے ہیں۔ یہ دنیا کی خوشنما مسجدوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اور مغلوں کے عہد کی بہت اہم یادگار ہے۔ اسے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر بلند کرسی پر بنایا گیا ہے۔

یہ ساتواں مقام تھا جہاں پر ہندوستان کی دارالحکومت کو خطۂ دہلی میں منتقل کیا گیا۔ اب سے دہلی کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ شہر پورے طور پر دارالسلطنت بن گیا۔ لال قلعہ یا قلعۂ معلےٰ شاہی محل تھا جہاں سے احکام شاہی صادر ہوتے تھے۔ لال قلعہ بڑی شان کی عمارت ہے۔ دیواریں خشکی کی طرف سے ۱۰۰ فٹ سے زیادہ زمین سے بلند ہیں۔ اب بھی کسی چاندنی رات میں جاکر دیکھو۔ جمنا کے رُخ سے ایک مسحور کن طلسمات کا خواب معلوم ہوتا ہے۔ اسکی جادو بھری فضا کا دلفریب اثر ہماری قوتِ تصوّر کو گھیر لیتا ہے اور

انسان کا تخیل خاکی زمین کو چھوڑ کر عالم روحانی کی سیر میں محو ہو جاتا ہے۔ لال قلعے کے اندر اب بھی نوبت خانہ دیوانِ عام، دیوانِ خاص، رنگ محل، خاص محل، ہیرا محل، جل محل، ممتاز محل، اسد برج، شاہ برج، موتی مسجد، باغِ حیات بخش، مہتاب باغ، ثمن برج، حمام، قابلِ دید عمارات ہیں۔ کسی زمانے میں دیوانِ عام کے سامنے نوبت خانے تک شامیانہ کھڑا ہوتا تھا۔ نوبت خانے کے سامنے ایک حوض تھا۔

قلعۂ معلّٰی جب بستا تھا تو اپنی شان میں دنیا کے تمام شاہی محلوں سے بڑھا ہُوا تھا۔ اسکے اندر صنعت و خوبی کے کئی محلات تھے جواب موجود نہیں اسکی تعریف میں وزیرِ باتدبیر سعداللہ خاں کا شعر کافی ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

جو دیوانِ خاصِ اندرونِ قلعہ کے دونوں طرف سنہری حروف میں لکھا ہُوا ہے ؎

کوئی دن تو اس پہ کیا تصویر کا عالم رہا
ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بنجائے تھا مومن

سعداللہ خاں چغتائی وزیروں میں، کہا جاتا ہے یہ سب سے دانشمند تھا قلعہ کے اندر شاہجہاں نے بہت سی قابلِ دید عمارات بنوائیں۔ بعد میں مختلف بادشاہوں نے اس میں اضافے کئے مثلاً "موتی مسجد" چھوٹی سی سنگِ مرمر کی مسجد ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب نے بنوائی۔ لاہوری اور دہلی دروازوں کے سامنے کے

گھونگھٹ بھی اسی نے بنوائے تھے۔ بہادر شاہ ثانی نے ظفر محل بنوایا، وغیرہ۔

اس زمانے میں شاہجہان کی بیٹی روشن آرا بیگم نے ایک باغ بنوایا جو دہلی کے مغرب میں واقع ہے اور اب روشن آرا کہلاتا ہے۔ چاندنی چوک کے سرے پر فتحپوری مسجد بادشاہ کی محل فتحپوری بیگم نے بنوائی تھی۔ شاہجہان نے اپنے زمانے میں کشمیر وغیرہ میں بھی بہت سی قابل تعریف عمارتیں بنائیں۔ شاہجہاں کے عہدِ حکومت کے قریب کے زمانے کی عمارات مغلئی طرز کی عمارات کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ امن و آسائش کا زمانہ تھا جس میں علوم فنون نے بہت ترقی کی۔

تختِ طاؤس بھی اسی بادشاہ نے بنوایا تھا۔ اس کی شکل مور سے ملتی تھی اور پشت مور کی دم کی طرح بنی ہوئی تھی۔ اس لئے تختِ طاؤس کہلایا اس میں بیش قیمت جواہرات ہیرے اور موتی لگوائے۔ دنیا کا بے بہا ہیرا "کوہ نور" بھی اس کی زینت تھا۔ جو اب بادشاہِ انگلستان و شہنشاہِ ہند کے تاج کو زیب دے رہا ہے۔ اس وقت خزانۂ مغلیہ میں سارے ہندوستان کی دولت تھی ماہرانِ فن کا گمان ہے کہ تختِ طاؤس کی قیمت کا اندازہ لگانا محال ہے مغل یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اب ہم روزِ قیامت تک ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ تخت بنوایا۔ اس میں ہیرے لگوائے۔ خزانہ خالی کر دیا۔ انکے ساتھ "کوہ نور" بھی لگوایا۔ نادر شاہ کا حملہ خدا کا قہر تھا۔ مالِ غنیمت میں تختِ طاؤس بھی

ایران پہنچا۔ اب وہاں اس کا صرف ڈھانچہ سا باقی ہے۔ دنیا کے زر و مال کا کیا بھروسہ ہے ؎

کسی کا ہُوا آج کل تھا کسی کا ۔۔ نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا۔ مومن

جب وہ دہلی میں تھا ۱۶۵۷ء میں شاہجہان پر فالج گرا۔ فصد کرنے سے بہت سا خون نکالا گیا۔ تو ہوش آیا۔ دارا شکوہ کشتی میں بٹھا کر اسے آگرے لے گیا۔ اس سبب سے سلطنت کے تمام کاروبار منقطع ہو گئے تمام علاقوں میں مشہور ہو گیا کہ عالم پناہ راہئی ملکِ بقا ہوئے۔ دارالسلطنت میں سب کا گمان تھا کہ اب اللہ ہی اللہ ہے۔ شہزادوں نے اپنی فوجیں آگرے کی طرف بڑھائیں۔ بیٹوں میں جنگِ تصفیہ، اس گھرانے کی پرانی رسم چلی آتی تھی۔ اورنگ زیب اور مراد کے متحدہ لشکر نے دارا اور شاہی فوجوں کی صفوں کو شکست دی۔ اورنگ زیب نے ایک تدبیر سے مراد کا فیصلہ کیا اور خود دہلی میں آکر تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنی خیر اس میں دیکھی کہ باپ کو آگرے کے قلعے میں بند کر دے۔ بیٹی جہاں آرا مرتے دم تک شاہجہان کے ساتھ رہی۔

خدا کی شان، نام شاہ جہاں تمام ہندوستان کا فرمانروا۔ بلخ و بدخشاں تک نام چلتا تھا۔ دکن کا فاتح۔ تاج محل اور لال قلعے کا بانی۔ پہلا شاہ ہند جس نے تختِ طاؤس پہ جلوس کیا۔ رعب کا یہ عالم کہ راجے اور نواب تھرائیں

اور اپنے بیٹے کی قید میں زندگی کے آخری آٹھ سال قلیل عرصہ نہیں! لہو کے گھونٹ پی پی کر گذارے۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

آخر ۱۶۶۶ء میں قیدِ حیات سے رہائی پائی۔ تاریخ ہوئی "شاہ جہاں کرد وفات" ۱۰۷۶ھ اب شاہجہاں اپنی بیوی ممتاز محل کے پہلو میں دنیا کی عمارتوں کے سرتاج "تاج محل" آگرہ میں استراحت فرما ہیں۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔ مذہب کا پابند، فضل و کمال کا سرپرست علوم و فنون کا حامی خدا ترس شاہجہان عمارتیں بنانے کا بڑا شائق تھا۔ اس کے عہد نے چند ایسی عمارتیں چھوڑی ہیں۔ جو دنیا کی بہترین عمارتوں کے زمرے میں شامل ہیں۔ اس وقت مغلئی دور کی طرز پورے عروج پر پہنچ چکی تھی۔

اب سلطنت کے کاروبار تمام تر دہلی میں سرانجام پاتے تھے۔ شاہی احکام و فرامین یہیں سے نفاذ پذیر ہوتے تھے۔ قلعہ بنوایا تو شاہجہاں نے تھا۔ مگر اورنگ زیب پہلا بادشاہ ہے جس نے اس کا معقول استعمال کیا۔ تمام مراحل مابین طے کرنے کے بعد ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کی تاج پوشی کی رسومات ۱۶۵۹ء میں ادا کی گئیں۔ تاریخ ہوئی "شہنشاہِ فلک اورنگ" ۱۰۶۸ شاہجہان کا یہ بیٹا ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل، آصف جاہ کی بیٹی کے بطن سے تھا۔ آصف جاہ نورجہاں کا بھائی اور سلطنت

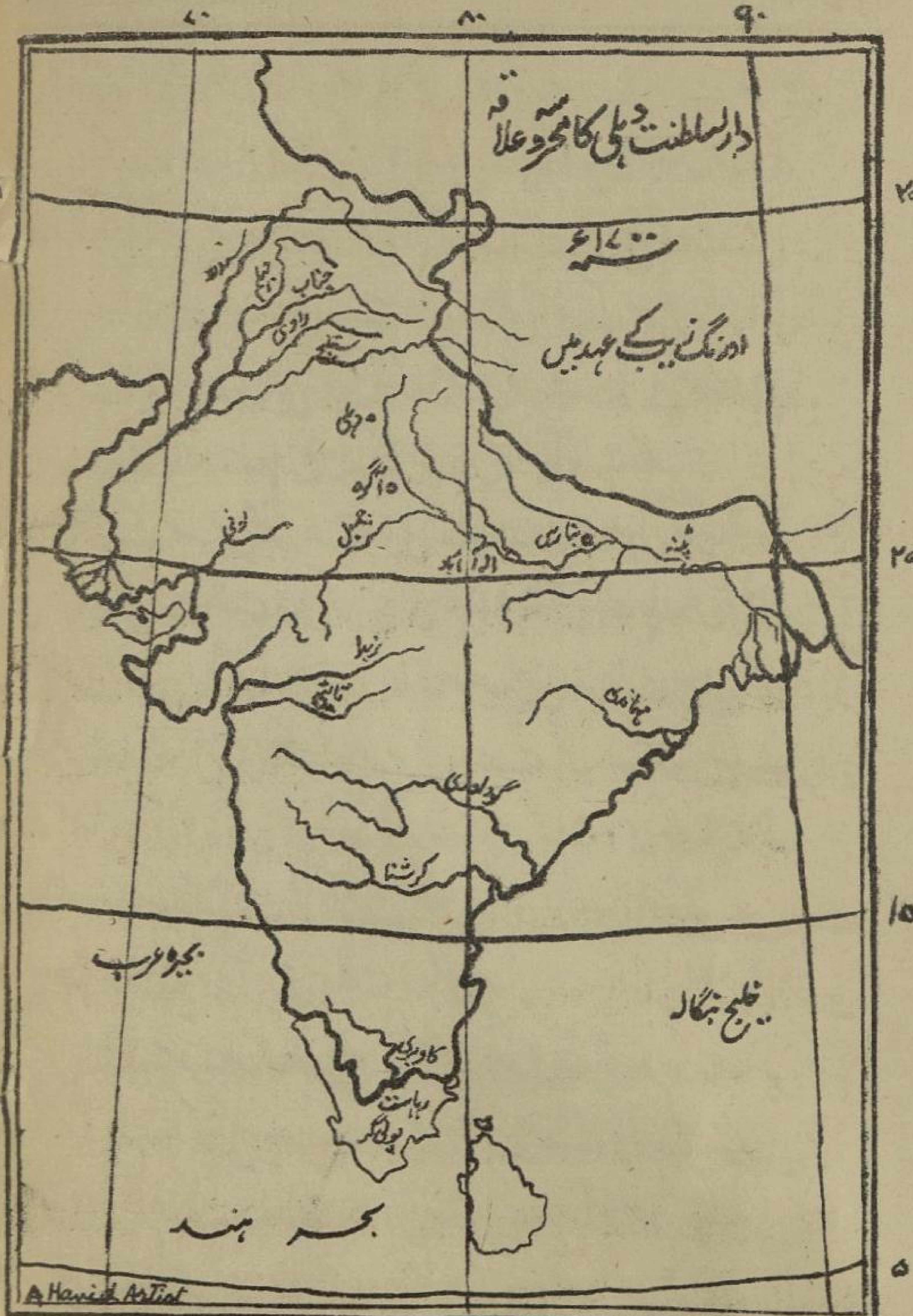
کا وزیر تھا۔

عالمگیر کے زمانہ میں روشن آرا کا مقبرہ، روشن آرا باغ۔ جہاں آرا کا مجر نظام الدین صاحب میں تیار کئے گئے۔ مسجد گھاٹ (جسے خیراتی گھاٹ بھی کہتے ہیں) دروازے کے اوپر کی "زینت المساجد" بھی اسی کے عہد میں بنی۔ اس مسجد کے اندر عالمگیر کی بیٹی زینت النساء بیگم کی قبر ہے۔ دہلی کی مسجدوں میں خوبصورتی کے لحاظ سے جامع مسجد کے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔

عالمگیر کے عہد میں تنجور اور ترچناپلی تک سے خراج وصول کیا گیا فتوحات کی انتہا ہو گئی اور سلطنت کمال کو پہنچ گئی۔ ہندوستان کے چاروں کونوں میں مغلوں کا پرچم لہراتا تھا۔ باہر کابل کا تمام صوبہ یعنی افغانستان ان کے قبضے میں تھا۔ بخارا بلخ بھی ممالکِ محروسہ میں شمار ہوتے تھے۔ اورنگ زیب نے اپنے بڑھاپے کا زمانہ دکن میں جنگ و فتوحات میں گذارا۔ اس ملک میں عرصۂ دراز تک قیام کیا۔ اس وقت دارالحکومت برہان پور اور اورنگ آباد تھا۔

اورنگ زیب خود آخری وقت زبانِ حال سے یہ کہتا ہُوا چل بسا

کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے — تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا — ایک دم آئے اِدھر اُدھر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں — چشم نم آئے تھے دامن تر چلے



دارالسلطنت دہلی کا محروسہ علاقہ
سنہ ۱۷۰۰ء
اورنگ زیب کے عہد میں
جہلم
چناب
راوی
ستلج
دہلی
آگرہ
چنبل
لونی
الہ آباد
بنارس
پٹنہ
نربدا
تاپتی
مہاندی
گوداوری
کرشنا
کاویری
بحر عرب
خلیج بنگال
بحر ہند
A. Hamid Artist

دوستو دیکھا تماشہ یہاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

میر درد

دکن کی مہم پر کمان خود ہاتھ میں لی۔ واپس آتے داعی اجل کو لبیک کہا۔ بمقام خلد آباد جو کہ روضہ کہلاتا ہے ضلع اورنگ آباد دکن میں بہت عامیانہ طریقے سے دفن ہوئے۔ سن ۸۹ سال کا تھا۔ مزار بہت سادہ ہے۔ تاریخ ہوئی

از خرد کردم طلب چوں سال نقل آں ولی گفت عالمگیر اورنگ ارم را داد زیب

اورنگ زیب بہت پکا متشی تھا۔ اور ہندوستان کے بہترین جرنیلوں میں چوٹی کا آدمی۔ ریاضت اور عبادت کی طرف طبیعت کا میلان بہت تھا۔ زندگی کے حشو و زواید سے متنفر۔ سادہ مزاج مگر سخت گیر۔ دبدبے کی یہ حالت تھی کہ اقربا کے دل لرزتے تھے۔ راز کے تفویض کرنے میں، ضرورت سے زیادہ محتاط تھا۔

عالمگیر کی وفات پر اس کا بیٹا معظم سلطنت حاصل کرنے کے لئے کابل سے فوج لیکر چلا۔ وہی پرانی رسم "جنگ تصفیہ" جہاں ان کے باپ نے دارا کو شکست دی تھی۔ آگرے کے قریب اس کا مقابلہ اپنے بھائی اعظم سے ہوا جو دکن کا حاکم تھا۔ کہتے ہیں اس جنگ میں اطراف کے ۶۵۰۰۰۰ جوان مصروف پیکار تھے معظم فتحیاب ہوا اور ۱۷۰۷ء میں محمد قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں مہرولی کی موتی مسجد اور اجمیری دروازے

کے باہر غازی الدین کا مقبرہ اور مدرسہ بنے۔ چن قلیچ خاں غازی الدین کی اولاد (نظامِ دکن) اب تک ملکِ دکن پر حکومت کرتی ہے۔ وفاتِ شاہ ۱۷۱۲ء میں ہوئی، مقبرہ اسکے پوتے فرخ سیر نے مہرولی میں بنوایا تاریخ ہوئی۔

ازوفاتش بے سر و بے پا شدند

"فیض و فضل و نعمت و عدل و کرم"

یعنی جب ہر لفظ کا پہلا اور آخری حرف کاٹ دیا جائے تو باقی مادۂ تاریخ رہ جاتا ہے۔

فتوحات کی تو اب حد ہو چکی تھی۔ عروج و ترقی کے تمام مدارج طے ہو چکے تھے۔ تمام علاقہ جو فتح کیا جاسکتا تھا زیرنگین تھا۔ لڑائیوں کا امکان ہی نظر نہ آتا تھا۔ تلوار کو زنگ لگ گیا۔ دل کو بھی اطمینان ہو گیا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی بلکہ جہاں تک تخیل کی رسائی تھی تمام علاقہ قلعۂ معلیٰ کا باجگزار دکھائی دیتا تھا۔ کمال کی انتہا ہو گئی عروج ختم ہو گیا چونکہ نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ ہر کمالے را زوالے مشہور بات ہے۔

بہادر شاہ کی وفات پر اس کا بیٹا معزالدین جہاں دار شاہ کوئی دو سال تک برسرِ حکومت رہا۔ عیش و آرام میں لِس گیا۔ عبداللہ اور حسن خاں دو سید بھائیوں نے آگرے کے قریب اسے شکست دی اور پکڑ کر جان سے مار ڈالا۔ ہمایوں کے چبوترے پر ۱۷۱۳ء میں دفن ہوا۔ بادشاہ گر سید بھائیوں نے پہلے بادشاہ

کے بھتیجے فرخ سیر کو تخت پر بٹھایا، جوان کے ہاتھوں میں محض کھلونا تھا۔ جب اس نے خود مختار ہونے کی کوشش کی تو اسے نابینا کر کے ۱۷۱۹ء میں قتل کر دیا۔ ہمایوں کے چبوترے پر دفن ہوا۔ سیدوں نے دو اور لڑکے رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ قلیل عرصے میں تخت نشین کئے۔ ایک قتل ہوا، دوسرا تخت نشینی کے تھوڑی مدت بعد فوت ہوا۔ دونوں مقبرۂ ہمایوں میں دفن ہوئے۔ تب انہوں نے ابوالفتح نصیرالدین روشن اختر محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ نام کو دہلی کے ماتحت تھے مگر سلطنت کے صوبہ دار خود مختار حاکم بن گئے۔ نظام الملک دکن میں اور آصف الملک سعادت خاں اودھ میں۔ ۱۷۲۰ء میں ایک جنگ کے دوران میں دونوں سیّد بھائی قتل کئے گئے محمد شاہ خود مختار ہو گیا۔

محمد شاہ کے عہد میں چاندنی چوک کی سنہری مسجد بنی جس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے جے پور کے مشہور جوتشی راجہ سوائی جے سنگھ نے ۱۷۲۴ء کے قریب جنتر منتر بنایا جو شاہجہان آباد سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا اصلی نام سمرات ینتر ہے جس کو عوام الناس کے اختلاط ذوق نے بگاڑ کر جنتر منتر کر لیا۔ یہ اعلیٰ درجے کی علمی ترقی کی قابلِ تحریم یادگار ہے۔ اسکے ذریعے چاند سورج اجرام فلکی کی حرکات، رفعت، فضا میں مقام کی تبدیلی وغیرہ کا پتہ لگاتے

تھے مشاہدات کے لئے ملازمین شب و روز متعین تھے۔ اُتنے بڑے بڑے نصب شدہ آلات سے خفیف سا تفاوت بھی بڑی وضاحت سے معلوم ہو جاتا تھا۔ اس راجہ نے اس طرح کی اور بعض اس سے بڑی رصدگاہیں متھرا، بنارس، اجین اور جے پور میں بنوائیں۔ ان تمام مقاموں کے مشاہدات اور معلیات سے نئے جدول تیار کئے گئے۔ یہ مشاہدات بہت صحیح تھے۔ اور ان سے اخذ شدہ ہیئت جوتش نجوم کے نتائج زمانۂ قبل کے تمام نتائج سے بہتر ثابت ہوئے۔ ابتک ہندوستان میں جوتشی ان کا استعمال کرتے ہیں۔

قلعۂ معلےٰ دارالسلطنت تھا اور عیش و نشاط کا مخزن۔ محمد شاہ پیا بڑے رنگیلے تھے۔ سراب عیش نے اس قدر جال پھیلایا تھا کہ صوبیدار اپنے علاقے چھوڑ کر لذتِ زبان، جنت نگاہ اور فردوس گوش کے حصول کے لئے دارالسلطنت میں پڑے رہتے تھے ؎

رات دن بادہ و صنم مومن کچھ تو پرہیزگار ہوتا تھا مومن

حضور ولی النعمت فضیلت و حشمت سے بھی معرا تھے۔ تمام ملک ہاتھوں سے نکل گیا صوبیدار خود مختار بن بیٹھے۔ مگر نام اب تک چلتا تھا۔

۱۷۳۷ء میں محمد شاہ نے نظام الملک کو دکن سے دہلی بلایا۔ ظاہر تو یہ کیا کہ سلطنت کی اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا منظور ہے مگر مقصود اس کی بے حرمتی تھی۔ نظام الملک بھی ۲۰ ہزار آدمی ساتھ لیکر دہلی آیا۔ دکن واپس جاکر

مرہٹوں کو اکسایا۔ انہوں نے یورش کی، باجی راؤ پیشواء کی سرکردگی میں کالکا کے مندر تک آن پہنچے۔ دے دلا کر واپس کیا۔

سچ یہ ہے کہ اس ہندوستان کی آرام طلب مٹی اور راحت پسند ہندی خون کی آمیزش نے بابری گھرانے میں تیموری جوش و حمیت نہیں چھوڑی تھی انتہا بھی ہو چکی تھی ؎

نہیں ثبات بلندیٔ عز و شان کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے ذوقؔ

عیش و آرام نے بالکل کاہل اور نکما بنا دیا تھا۔ وہ حکمرانی کی ہمتیں اور اوصافِ حمیدہ ہی باقی نہیں رہے۔ جس قوم نے زر کی محبت اور موت کا خوف اپنے دل میں ایجاد کیا وہ مٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ع

اور اگر تم رو گردانی کرو گے تو اللہ تمہارے بدلے لے آئیگا دوسری قوم کو۔ پھر وہ تم جیسے نہ ہونگے!

فرقانِ حمید

یعنی اور تو اور اگر تم مسلمان بھی اللہ تعالےٰ کے احکام سے نافرمانی کرو گے ان کے احترام و منزلت کو برطرف رکھتے ہوئے، ان پر پورے طور سے عمل پیرا نہ ہوگے تو اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر جس کے ہاتھ میں تمام کائنات کی باگ ہے تمہاری بجائے ایک دوسری قوم بھیجیگا۔ تمہاری عزت و افتخار کی جگہ ان کو

مرحمت کی جائے گی۔ وہ تمہاری طرح نہ ہونگے! بلکہ اُن میں وہ صفات و عادات ہوں گی۔ جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور اُس کی رضامندی کا عین منشاء ہے۔ جس قوم میں حکمرانی اور رعایا پروری کی صلاحیت ہوتی ہے خدا اسی کو منصبِ جلیلہ پر جگہ دیتا ہے۔ جب یہ خوبیاں اُن سے مفقود ہو چکتی ہیں۔ جب عیش و آرام کی زندگی اور لہو و لعب کی مجلسیں اُن کے دل و دماغ کو معطل اور مختل کر چکتی ہیں تو اُن کی بجائے دوسری صاحبِ عمل قوم کو بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ حکم الٰہی ہے۔ فرمانِ خداوندی ٹل نہیں سکتا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا۝ اور تم ہمارے (یعنی خدا کے) قاعدے میں تغیّر نہ پاؤ گے۔ (قرآنِ کریم)

صوبہ دارِ دکن نظام الملک کی شاہی دربار میں ایک دفعہ پھر طلبی ہوئی اور وہاں اس سے بدسلوکی کی گئی۔ اس نے سعادت خاں سے ملکر قلی خاں شاہِ ایران کو خط لکھا، تاکہ محمد شاہ کو سبق حاصل ہو۔ بادشاہ تو مجہول تھا نظام الملک اور سعادت خاں سلطنت کے وزیروں نے جب خود ایران کے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ تشریف لائیے، نگاہیں منتظر ہیں۔ تو اسے کیا اعتراض تھا ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ۔۔۔ کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد ۔۔۔ حافظ

کیا حقِ نمک ادا کیا! ان امرا کو اپنے بادشاہ اور ملک سے کتنی محبت تھی! مگر انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ؎ شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت۔

یہ ہمارے لئے بھی آفتِ جان ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی ایران کا بادشاہ قلی خاں عرف نادر شاہ کابل ہوتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ہندوستان پہنچا۔ پشاور اور لاہور کے صوبہ دار سدِ راہ نہ ہوئے چونکہ دربار کے وزیروں نے پہلے کہلا بھیجا تھا کہ تم معترض نہ ہونا ؂

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

خود تو محمد شاہ رنگیلے "ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے نابِ اولا" کہکر قلعے سے باہر نہ گئے۔ مغلئی افواج کو کرنال کے مقام پر شکست ہوئی اور نادر شاہ دہلی میں داخل ہؤا۔ لال قلعے میں بادشاہ کا بن بلائے مہمان بنا۔ محمد شاہ صرف مثمن برج میں سکونت پذیر تھا۔ باقی قلعے میں نادر شاہ براجمان۔

نادر شاہ بچپن میں علاقہ خراساں میں گڈریا تھا۔ دیو ہیکل، جابر اور تند مزاج انسان تھا۔ ماتھے پہ ہر وقت تیوڑی پوستین کا چغہ زیب تن کسی بات پر شہر والوں سے جھگڑا ہؤا اور نادر شاہ نے قتلِ عام کا حکم صادر فرمایا ۱۱ مارچ ۱۷۳۸ء قیامت کا دن تھا۔ آٹھ بجے صبح سے لیکر تین بجے بعد دوپہر تک جو کوئی بوڑھا بچہ مرد عورت، سامنے آیا تیغ کے گھاٹ اُترا ایک لاکھ سے زیادہ جانیں دلی کے گلی کوچوں میں ہلاک ہوئیں گلیوں میں کشتوں کے پشتے لگ گئے، ان کے ہٹانے میں کئی دن صرف ہوئے

بڑی مشکلوں سے نادر شاہ مانا - یہ کہنا تو درکنار،

آپ ہی اپنی جفاؤں پر ذرا غور کریں   ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی

کسی کو اتنی جرأت نہ تھی۔ کہ عفو تقصیر کے لئے التجا کرے آخر آصف جاہ وزیر تلوار گلے میں لٹکا، حاضر ہوُا - عرض کیا۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی   مگر کہ زندہ کُنی خلق را و باز کشی

تو کچھ غصّہ ٹھنڈا ہوا۔ صمصام نیام میں کی - اس کے چار دن بعد چھوٹے پیمانے پر ایک اور قتل کا ہنگامہ ہُوا دریبہ کلاں کا چاندنی چوک کی طرف کا دروازہ اب تک خونی دروازہ کہلاتا ہے - چونکہ یہاں سے قتل شروع ہُوا تھا۔

نادر شاہ کوئی دو مہینے یہاں رہا - اپنے ایک بیٹے کی شادی تیموری گھرانے کی ایک بیٹی سے رچائی - اس خاتون کی قبر نظام الدین کے احاطے میں ہے اور نادر شاہ کی بہو کہلاتی ہے - ایرانی حملہ آور بے حساب مال و دولت کے علاوہ تختِ طاؤس بھی اپنے ساتھ مالِ یغما میں لیتا گیا۔ دہلی تباہ ہوگئی - بے حد لوٹ ہوئی - انسان فنا کر دیئے، دولت ساتھ لے گیا۔ باقی غلاف رہ گیا۔ روح پرواز کر گئی - اس حملے نے سلطنت کو بہت نحیف کر دیا شاہی دبدبہ محو ہو گیا۔ ایسی مصیبت خدا کسی کو نہ دکھائے - اس واقع کا ڈر اور وحشت دہلی والوں کے دلوں سے عرصے تک محو نہ ہو سکا

نادرشاہ یہاں کے طور دیکھ، اصلیت کو بھانپ گیا۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری[1] — اقبال

دونوں کوتاہ اندیش وزیروں کو بے طرح جھاڑا۔ سعادت خاں غیرت کے مارے زہر کھا کر مر گیا۔ مگر نظام الملک دل کا مضبوط نکلا۔ دکھاوے کے لئے زہر کے بہانے کچھ پیا اور اپنی جان بچالی۔

اب سلطنت کمزور ہو گئی۔ اور رستہ کھل گیا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں درانی افغان احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا رخ کیا۔ نادرشاہ کی واپسی کے بعد قمرالدین سلطنت کا وزیر مقرر ہوا۔ اس کی سرکردگی میں مغل افواج نے احمد شاہ کو شکست دی۔ یہ مغلوں کی آخری فتح تھی۔ قمرالدین اپنے خیمے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک توپ کا گولہ آ کر لگا۔ اور وہ شہید ہو گیا۔ بادشاہ کو اس حادثے کی خبر پہنچی۔ اتنا صدمہ ہوا کہ وہیں غش کھا کر گرا اور دم نکل گیا۔ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے ایک حجرے میں مدفون ہے۔ بادشاہ کی محل نواب قدسیہ بیگم نے ایک عمارت اور باغ بنوایا جو کشمیری دروازے کے باہر "قدسیہ باغ" کے نام سے اب بھی مشہور ہے۔ گو احمد شاہ معرکے کے بعد سرہند سے واپس پھر گیا لیکن سلطنت مغلیہ کی طاقت کو اس

[1] ہری کے معنی خدا ۱۲

ساتے بھی کمزور کر دیا۔

۱۷۴۸ء میں مجاہد الدین ابو النصر احمد شاہ تخت پر بیٹھا، لیکن ایک فحش سیاسی بے اعتدالی کے سبب امراء نے ۱۷۵۴ء میں معزول کر دیا نواب منصور علی خاں صفدر جنگ سلطنت کا سپہ سالار اور احمد شاہ کے زمانے میں وزیر تھا۔ اس کے بیٹے نے اس کا مقبرہ ۱۷۵۳ء میں بنایا جو شاہجہاں آباد سے پانچ میل پر جنوب کے رُخ واقع ہے اور اب صرف صفدر جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ "صفدر جنگ" خاندانِ مغلیہ کے طویل سلسلۂ تعمیرات میں اس عظمت کی غالباً آخری یادگار ہے۔ یہ دورِ انحطاط کی ساخت ہے اور اس لئے اس میں وہ نفاست اور سبکی نہیں۔ "صفدر جنگ" میں اصولی نقص یہ ہے کہ ایک عالیشان عمارت کو نقش و نگار سے مرصع کرنے کی بجائے نقش و نگار سے عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے پلستر کا استعمال اندازے سے زیادہ ہے۔

طرزِ تعمیر کے مغلئی دور میں ایرانی اشکال و خیالات کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ عمارتوں کی بناوٹ افغانی سے بدل کر ایرانی نظر آنے لگی، جس میں شاعرانہ گنبد اور رائش کی فضا میں دلآویز کشش ہوتی ہے اس عہد میں طرزِ تعمیر بالکل اسلامی ہو گئی۔ مغلوں نے مکمل اور سادہ گنبد بنائے جن پر کوئی نقش و نگار اور خوبصورتی میں اضافہ

کرنے کے لئے برجیاں وغیرہ نہ تھیں ان کے اوپر پیتل کا کلس لگایا اونچی سادہ نوکدار محرابیں بنائیں۔ مینار سرو کی طرح پتلے اور لمبے۔ نماز پڑھنے کے لئے مسجدوں کے کھلے اور فراخ صحن کی ضرورت تھی۔ ان میں غلام گردشوں اور دالانوں کا استعمال کیا گیا عمارت کی دیواروں کے قطعے بغیر کسی پیچیدہ نقش ونگار کے چھوڑ دیئے گئے۔ مساجد کے اندر، سامنے کا رُخ آیات سے منقش کیا جاتا تھا، نمونہ بہت واضح اور مرعوب کن۔ نقوش اور شکلیں نمایاں اور بڑی بڑی ہوتی تھیں۔ جالیوں اور پتھروں کی تراش میں ہندسی شکلیں اور پھول پتے بنائے جاتے تھے۔

اکبر کی فتوحات کے ساتھ، ایرانی اثرات کے ماتحت، عمارتوں کی بناوٹ میں تبدیلی واقع ہوئی۔ عہد اکبری کے ابتدا میں سادہ اسلامی نقشوں کی طرف میلان ہؤا۔ مغلوں نے گنبد کے اوپر پتھر کے تراشیدہ کنول یا سادہ چوٹی کے بجائے پیتل کا کلس لگانا شروع کیا۔ انہوں نے تمام قسم کے عمارتی مسالہ کا جو دستیاب ہوسکا، جائز استعمال کیا۔ اقسام کے رنگدار پتھر رغنی اینٹیں، بعض اوقات قیمتی پتھر زینت کو دوبالا کرتے تھے۔ اکبر کی بیویاں ہندو بھی تھیں۔ ان کے خیالات کے ماتحت اس نے فتح پور سیکری اور سکندرے میں ہندوانہ طرز کی عمارتیں بنائیں

مگر دہلی میں نقشہ نہ بدلا۔ مستطیل کمرے عمودی دلواریں، اونچے گردنے والے گنبد اور برجیاں بعض دفعہ گنبد بہت اونچا کر دیا جاتا تھا شیر شاہ سُوری نے چونکہ وہ پٹھان تھا افغانی طرز کو قائم رکھا۔

شاہجہاں کے عہد میں جب موجودہ شہر دہلی (شاہجہاں آباد) بنا فنِ تعمیرات اور نقشہ میں بہت اہم تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ نقشہ مکمل ہو چکا تھا عمارتیں پاکیزگی اور عظمت کا نمونہ روحانی فضا سے بھرپور، نازک نقش و نگار سے ڈھکی ہوئی تھیں مغلئی دور کا اس انتہائی عروج اور اعلےٰ عمارت سازی کا زمانہ بہت قلیل ہے مگر اس تھوڑے عرصہ میں چند بیش بہا نمونے معرضِ وجود میں آئے مغلوں کے آخری زمانے میں جب سلطنت کا انحطاط تھا عمارتوں کی ساخت میں بھی انحطاط کی جھلک نمایاں ہے۔ یہ نمونے آپس میں کچھ مختلف ہوں لیکن تمام میں مشترکہ عنصر موجود ہیں۔ یعنی ہم مرکز اینٹوں کی محراب گنبد اور کلس۔ مربع کمرے کے اوپر گنبد گول بنانے کے لئے اندر کے رُخ چاروں کونوں میں بتدریج بڑھتی ہوئی محرابیں۔

ہمایوں کے مقبرے کا گنبد صحیح ساسانی شکل کا ہے۔ اونچے گردنے پہ رکھا ہؤا براق مرمر کا بنا ہؤا اسطحات میں مکمل۔ اس کے اوپر پتھر کی چوٹی کی بجائے پیتل کا کلس لگا ہؤا ہے۔ یہ دنیا کے خوبصورت ترین گنبدوں میں سے ایک ہے۔

ہندوؤں کے اونچے چار کونوں کے نوکدار گاؤدم پُر از نقوش و زوائد مندروں اور دروازے کے داسے کے خلاف مسلمانوں کے سادہ بڑے بڑے گنبد اور ڈاٹیں طرزِ تعمیر کی جان ہیں۔ زمانے کے ساتھ گنبد کا ارتقا قابلِ غور ہے۔ گنبد میں اینٹوں کو اندر کی طرف بتدریج بڑھا بڑھا کر گولائی پیدا نہیں کی جاتی۔ صحیح گنبد کی تعریف یہ ہے کہ اینٹوں کی تراش اندر سے چھوٹی اور باہر سے گاؤدم بڑھتی ہوئی، اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ وہ گنبد کے اوپر ایک دوسرے میں خود بخود پھنس جاتی ہیں۔ اور نیچے نہیں گر سکتیں۔ اس طرح ان تمام اینٹوں کے پہلوؤں کی سطح سے تشکیل کردہ خطوں کا ملتقیٰ ایک نقطہ پر ہوتا ہے۔ یعنی گنبد اور اسی لحاظ سے ڈاٹ کی اینٹیں ہم مرکز وضع کی ہوتی ہیں۔

ابتدائی دور میں گنبد بہت نیچا ہوتا تھا۔ دیواروں کی گولائی چھت کے ساتھ سے شروع کر دی جاتی تھی جس سے گنبد چپٹا سا معلوم ہوتا تھا۔ اسکے بعد دیواروں کو ذرا اونچا کرنے کے بعد گول کیا جاتا تھا اور اس کی شکل اس طرح معلوم ہوتی تھی جیسے افغانی کلاہ ہوتا ہے۔ دیواریں اور اونچی کی گئیں اور گنبد کو بیچ میں باہر کے رُخ خم دیا گیا۔ اس کی شکل اسطرح ہو گئی جیسے شلجم میز کے اوپر رکھا ہوا ہو۔ اس کے بعد دیواروں کو سیدھا اٹھا کر نیچے ایک استوانہ سا بنا دیا جاتا تھا جسے گردنا کہتے ہیں

اس کے اوپر وہی گول شلغم کی شکل کا گنبد بنایا جاتا تھا۔ اس کی شکل اسطرح معلوم ہوتی تھی جیسے آدمی کی گردن پہ سر رکھا ہُوا ہو۔ مختلف عہدوں کی عمارتوں کے گنبدوں کا ملاحظہ کرنے سے یہ امر واضح ہو جائے گا ؛

۱۰- شاہجہان آباد- دورِ ثانی

احمد شاہ آخری مغل تاجدار ہے جو بادشاہ کہلانے کا مستحق ہے۔ بعد میں صرف نام رہ گیا تھا حکومت کی باگ کسی اور کے ہاتھوں میں تھی قاعدے کی بات ہے جب کسی ملک کا اقتدار اور تجمل گھٹتا ہے۔ تو والئے ریاست پر تن آسانی اور عیاشی غالب آجاتی ہے۔ محمد شاہ تو بالکل "ایں دفتر بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ" تھے۔ اس کے بعد سے بادشاہ ملک داری کے فرائض اور مردانہ اصولوں کو خیر باد کہکر بادہ مستی اور شاہدانِ بازاری کے حسن کی رنگ رلیوں میں ایسے محو ہوئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی۔

احمد شاہ کے بعد ابوالعادل عزیز الدین محمد عالمگیر ثانی، جہاں دار شاہ کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس کا وزیر نظام الملک کا پوتا عماد الملک غازی الدین خان تھا اور تمام سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک۔ اس کا مقبرہ مدرسہ اور مسجد اجمیری دروازے کے باہر اب بھی موجود ہے جس میں دہلی عربک کالج ہے۔ اسکے اندر کی طرف بیچ کے دروازے میں لکھا ہے ؎

نہ ہر لوح نقشے بماند و لیک
جزائے عمل ماند و نام نیک

چشم ہوش اور دِل ..... ارجمند ذرا توجہ دینا کیا غیر فانی نقطہ مکتب کی پیشانی کا تلک بنایا ہے۔

اب دہلی کی سلطنت، شہر کے اطراف میں چند ضلعوں تک محدود تھی کہاں سے کہاں آگئی۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ تمام ہندوستان کے ملکی احکام قلعۂ معلّے سے جاری ہوتے تھے آج یہ حالت ہوئی۔ کہ سلطنت مغلیہ کا رقبہ چند میلوں پر مشتمل تھا۔ سلطنتِ شاہ عالم۔ از دہلی تا پالم پور چونکہ پالم پور میں ان کی چند ذاتی جاگیریں تھیں۔

عالمگیر ثانی نے حماقت کی اور وزیر غازی الدین کی طاقت کو کم کرنے کے لئے احمد شاہ درانی کو پھر بلایا۔ غازی الدین نے فوجیں تیار کیں۔ مگر بادشاہ کی سازش کے سبب مقابلہ نہ کر سکا۔ احمد شاہ نے مجبوراً دوستانہ تعلق پیدا کیا۔ اس طرح احمد شاہ دُرانی (ابدالی) اب کے غالب رہا۔ گھر میں خود اتفاق نہ تھا غیر کا مقابلہ کون کرے۔ جنوری ۱۷۵۷ء میں دہلی میں داخل ہؤا۔ اپنے احکام جاری کئے۔ بڑے جبر و تشدّد سے لوگوں سے سیم و زر نکلوایا رنگ نادر گردی کا تھا۔

احمد شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی ایک ہی شخص ہے درانی اس لحاظ سے ہوا کہ وہ افغانوں کے قوم درّانی پٹھانوں کا ایک فرزند تھا اور ابدالی اس لئے کہ وہ علاقہ ابدال کا رہنے والا تھا۔ اسی لحاظ سے

دونوں یہاں مرقوم ہیں۔

راستہ کھلا ہوا تھا۔ پھر طبیعت آ گئی۔ ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ فوج لے کر پھر دہلی پر حملہ آور ہوا۔ اس اثناء میں بادشاہ، غازی الدین وزیر کے ایما سے قتل ہوا۔ احمد شاہ نے قتلِ شاہ کے جرم میں شہر والوں پر بڑی سختی کی سات دن تک قتل اور غارتگری رہی۔ احمد شاہ واپس چلا گیا۔ مگر اپنی قوم کے آدمیوں کو یہاں چھوڑتا گیا۔ درانی سردار قلعے پر قابض تھے۔

مرہٹوں اور جاٹوں نے مل کر درانیوں کی قلعے کی فوج کو شکست دی اور شہر میں گھس آئے۔ بے تحاشا لوٹ مار شروع کر دی۔ بار بار کی لوٹ سے یہاں کیا رکھا تھا لیکن ہاتھی مرا ہوا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جو کچھ نظر آیا لوٹ لیا! دیوانِ خاص اندرونِ لال قلعہ، کی چاندی کی چھت ادھیڑ کر گلوادی۔ قلعہ کی موتی مسجد کا جواہرات کا لچھا گھسوٹ لیا۔ قیمتی پتھر، جو کہیں نظر پڑا تمام تیز اوزاروں سے نکال لئے۔ قزاق کا کیا ہے؟ جو کچھ مل جائے۔

احمد شاہ تازہ دم فوج لیکر مقابلے کی غرض سے شمالی دروں سے پھر داخل ہوا۔ مرہٹوں اور جاٹوں کی فوجوں کا کوئی شمار نہیں کیا جا سکتا گویا تمام ہندوستان کے راجاؤں کے کثیر التعداد لشکروں کے ساتھ لٹیروں قزاقوں کا بھی ایک ٹڈی دل تھا۔ مجتمع فوجوں کا ایک سمندر لہریں مار رہا

تھا جس کا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ احمد شاہ کی فوج کی تعداد نہایت قلیل تھی۔ نفری کے لحاظ سے فریقین میں کوئی نسبت نہ تھی۔ تیسری دفعہ ۶ جنوری ۱۷۶۱ء کو میدانِ جنگ وہی پانی پت قرار پایا۔ مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ ان کا بڑا قتلِ عام ہوا اور بھاگتے ہی بن پڑی۔ اس طرح ایک ہی مقام پر تیسری دفعہ "بھارت دیش میں ہندو راج" کا خواب خاک میں مل گیا احمد شاہ نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ لیکن عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم کو الہ آباد سے بلا لیا۔ اور خود دست کش ہو گیا۔ اسی زمرے کی غلطیوں کے طویل سلسلے کی یہ بھی ایک سیاسی غلطی تھی۔ شانِ کبریا! مغل تخت و تاج کا کچھ ایسا رعب تھا کہ فتح کرنے کو تو بہت سے کامیاب ہو گئے مگر اس پر مستقل قبضہ کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ مغل تاجدار کھلونا ہی سہی۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بنا رہا۔ مگر بادشاہ کی حیثیت میں دنیا کے سامنے اسے پیش کرنا پڑا۔ اس کی آڑ میں کوئی کچھ کرتا رہے۔

ابوالمظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر شاہ عالم ثانی، نام کو بادشاہ تو بن گئے مگر دس برس تک الہ آباد میں ہی رہے۔ دہلی میں کیا رکھا تھا۔ یہاں آئے دن آفت برپا تھی۔ دہلی طوفان کا مرکز تھی۔ ہنگامہ کہیں ہو ٹیس یہاں اٹھتی تھی۔ برق چمکے کہیں گرتی یہیں تھی جس بستی

پر اس قدر جہاں سوز اور قیامت خیز حملے ہوں۔ جن کی خاک کو روز کے قتل عام کی آفتوں کے بھونچال پتال تک ہلادیں۔ جس پر خرمن سوز بجلیاں مصیبتوں کے بادل بن کر برسیں اور محشر آفرین آتش خیز بن کر زمین سے ابھریں۔ اس کی عظمت اور زینت کے برقرار رہنے کا کوئی امکان نہیں۔ سلطنت کیا تھی بزرگوں کا نام چلتا تھا۔ اس بادشاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ پیٹ کے دھندے کے لئے غنیمت تھا۔

شاہ عالم کا بیٹا مرزا جوان بخت دہلی میں تھا۔ ۱۷۶۳ء میں سورج مل جاٹ کے بیٹے نے مرہٹوں سے مل کر تین مہینے تک دہلی کا محاصرہ کیا لیکن ناکام رہا۔ اس وقت تک سکھ جنگی طاقت حاصل کر چکے تھے ۱۷۶۷ء میں انہوں نے دلی کا ہلہ بول دیا۔ اس وقت وزیر نجیب الدولہ رہیلہ تھا اس نے درانی کو پیغام بھیجا مگر وہ پانی پت سے آگے نہیں بڑھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس غرض کے لئے ایک دفعہ پھر ہندوستان میں قدم رکھا اور یہ سکھ گردی کی آفت اس طرح ٹلی۔

شاہ عالم ۱۷۷۱ء میں دہلی آیا۔ مرہٹوں کے لشکر سے تعلق آباد کے قریب بدرپور پر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ اس کا وزیر نجف خاں تھا جس نے اس کے عہد حکومت میں ۱۷۷۹ء میں میرٹھ کے مقام پر

سکھوں کو شکست دی تھی ۱۷۸۲ء میں فوت ہوا۔ اس کا مقبرہ صفدر جنگ کے قریب مقام علی بخش میں ہے۔ آخر کار شاہ عالم مرہٹوں کی سپردگی میں آگیا وہاں سے وظیفہ ملتا تھا۔ عافیت اسی میں نظر آئی۔ مرہٹوں نے لال قلعہ میں فوج بٹھا دی۔ یہ لڑائیاں روز کی ایک مصیبت تھی اور دہلی کی سرزمین حشر کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ جہاں آئے دن نئی قیامت بپا تھی۔ اب کے غلام قادر رہیلہ رنگ لایا اور اس نے شاہی خاندان پر وہ مظالم ڈھائے کہ دشمن بھی الاماں پکار اٹھے ؎

واردشکایت ہرکس زدشمن　　　ما را شکایت از آشنائے

نجیب الدولہ مرا تو اس کا بیٹا ضابطہ خاں رہیلہ شاہ عالم کا وزیر بنا۔ اُس نے مرہٹوں سے لڑائیاں لڑیں۔ منصب وزارت کا ایک اور دعویدار نجف خاں بھی تھا۔ ان دونوں کی آپس میں مخالف رہتی تھی اور وزارت کبھی اس کے پاس کبھی اس کے پاس جب وزیر ضابطہ خاں نے ۱۷۸۵ء میں انتقال کیا تو اس کا بیٹا غلام قادر جاگیر کا وارث ہوا اور خاندانی رعایت سے قلمدانِ وزارت بھی غلام قادر خاں رہیلے کے سپرد ہوا۔ شاہ عالم مرہٹوں کی اطاعت میں تھا۔ وزیر کی ترقی مدارج کے بہانے سے مرہٹوں سے بگاڑ ہوئی اور وہ دہلی چھوڑ شاہدرہ میں جمنا پار چار میل پر ۱۷۸۷ء میں فوج لے کر میدان میں اتر آیا۔ مرہٹوں نے لال

قلعے سے گولہ باری کی۔ اس کا جواب ترکی بہ ترکی ملا۔ وزیر رہ چکا تھا سپاہیوں کو توڑ لیا۔ کئی دفعہ اس طرح لڑائی رہی اور دربار شاہی میں باریابی بھی ہوئی۔ لیکن غلام قادر کا دماغ فرعون سے زیادہ ہو گیا تھا۔

انتی بھی بد مزاجی لحظہ لحظہ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے، جھگڑا ہے آسماں سے — میر تقی

وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کئی دفعہ قلعے پر گولہ باری کی۔ آخر بادشاہ سے قرآن بیچ میں رکھ کر عہد و پیمان ہوئے اور وزارت پھر مل گئی۔ مگر غلام قادر کے سر پر جن سوار تھا۔ بادشاہ کو قید کر دیا اور ایک شہزادے بیدار بخت کو قید سے نکال کر، نام کو تخت پر بٹھلایا۔ اب رہیلہ خود بادشاہ تھا چونکہ جو جی میں آتا کرتا۔ طرح طرح کی غلطیاں اور بدعنوانیاں اس شخص سے ہوئیں۔ شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ بیگمات کو بے حرمت کیا اور وہ وہ مظالم روا رکھے کہ ان کے بیان سے قلم کانپتا ہے ؎

بے مروت، بے وفا، بے دید، اے نا آشنا
آشناؤں سے نہ کر بے رحمی و بے گانگی — حاتم دہلوی

آخر مرہٹوں کے ڈر سے قلعے سے بھاگا۔ کچھ عرصے کے بعد گرفتار ہوا اور مرہٹوں کے سردار سیندھیا کے پاس بھیجا گیا۔ وہاں اس کو گدھے پر الٹا سوار کیا گیا۔ اور شہر میں پھرایا۔ زبان نکال دی کان ناک ہاتھ کاٹ دیئے

درخت پر الٹا لٹکا دیا، گن گن کر بدلے لئے۔ غرض بڑی اذیتوں سے مارا

؎ حق بحقدار رسید۔

چرخِ فلک کی چکی بہت آہستہ گھومتی ہے مگر اس سے بہت زیادہ باریک پیستی ہے۔ کوئی غلط کار اس کی زد سے بچ نہیں سکتا۔ خدائے سخت گیر آزمائش کی مدت دراز کرتا ہے اور مہلت دیتا ہے کہ کج رو دماغ راہ راست پہ آئے۔ مگر انسان ہے کہ ایک گہرائی سے نکل کر اس سے عمیق تر گہرائی میں گرتا ہے۔

غلام قادر رہیلے کا نام ظالم اور جابر ضرب المثل ہے۔ تیمور کی اولاد بابر کے جانشین، شاہجہانی محلات کے ساکن اور اپنے پروردہ کے ہاتھوں اس طرح ذلیل ہوں۔ اس گھرانے میں تیموری غیرت، حمیت اور شجاعت ہی کہاں رہی تھی۔ اب تو پردہ بھی فاش ہوگیا تھا۔ شاہ عالم نابینا ہوگیا۔ لیکن بادشاہ رہا۔ شاید دنیا میں ایک ہی مثال ہو۔ امورِ سلطنت میں کرتا دھرتا تو پہلے بھی کچھ نہ تھا، نام ہی نام تھا۔

اس دوران میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کافی طاقت حاصل کرلی تھی۔ مرہٹوں کی انگریزوں سے مغربی ہند کی پرانی پرخاش چلی آتی تھی۔ یہ سلسلہ دہلی تک بھی پہنچا۔ چونکہ یہ شہر دار السلطنت تھا سب کا اسی پر دانت تھا ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے کے لئے اس پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔

آخر ۱۸۰۳ء میں دہلی کے محاذ میں جمنا کے مشرقی کنارے پر انگریزوں اور مرہٹوں میں مٹ بھیڑ ہوئی۔ مرہٹے بھاگ گئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ایک دفعہ پھر لشکر سمیٹ کر بڑے ساز و سامان کے ساتھ آئے اور اب کے بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ شاہجہان آباد شہر کو عرصے تک گھیرے رکھا فصیل کو کئی جگہ سے گولہ باری سے گرا دیا۔ بڑی دقت سے پسپا کیئے گئے۔

اب شاہ عالم کا کمپنی سے وظیفہ شروع ہؤا کچھ جاگیر تھی۔ اختیارات تمام کمپنی کے تھے۔ انتقال ۱۸۰۶ء میں ہؤا۔ خواجہ نظام الدین کی چاردیواری میں دفن کیا گیا۔

کشتیٔ عمر آترے عدم آباد آیا بحرِ ہستی کا کنارہ دلِ ناشاد آیا
شکر صد شکر کہ آیا ملک الموت رفیق آج اس وعدہ فراموش کو میں یاد آیا

باپ کی وفات پر ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہؤا۔ انگریزوں کا اقتدار روز افزوں ترقی پر تھا۔ یہ حسب معمول قلعے میں نظر بند اور کمپنی کے وظیفہ خوار تھے۔ انگریزوں نے اس کے زمانے میں شاہجہان آباد کی فصیل کی اچھی طرح مرمت کرادی۔ جو کئی جگہ سے مرہٹوں کے حملے میں شکستہ بھی ہو چکی تھی۔ ۱۸۱۱ء میں غازی الدین کے مدرسے بیرون اجمیری دروازہ کے گرد فصیل بنا کر بادشاہ کے حکم سے یہ احاطہ شہر کی آبادی میں داخل کیا گیا۔ اس نے درگاہ نظام الدین اولیا میں مرزا جہانگیر کا مجر بنوایا۔

اس زمانے میں سر طامس تھیافلس مٹکاف دربار شاہی میں انگریزوں کی طرف سے رزیڈنٹ مقرر تھا۔ وہ تمام عمر یہیں رہا۔ اور یہیں سپردِ خاک ہوا قبر کشمیری دروازے کے اندر سینٹ جیمس کے گرجے کے احاطے میں واقع ہے۔ اس نے رہائش کے لئے برلبِ جمن ۱۸۴۴ء میں ایک شاندار کوٹھی بنوائی "دلکشا" نام رکھا جو اب "مٹکاف ہوس" مشہور ہے، اور کشمیری دروازے کے باہر دور واقع ہے (نقشہ ملاحظہ ہو) اس عمارت نے غدر کے دوران میں بھی شہرت حاصل کی جستہ ہوگئی تھی اب پھر مرمت ہو کر نئی بن گئی ہے۔

ہندوراؤ کا باڑہ کشمیری دروازے کے باہر غدر کی رج کے اوپر واقع ہے دہلی میں ایک شخص ولیم فریزر گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ اس نے پہاڑی کے اوپر کھلی ہوا میں رہنے کے لئے ایک کوٹھی ۱۸۳۰ء کے قریب بنوائی مرہٹوں کے مہاراجہ دولت راؤ سندھیا والئے گوالیار کی وفات پر اس کی رانی بائیزا بائی پر حکومت ہوئی۔ اس رانی کے بھائی کا نام ہندو راؤ تھا۔ ۹ سال کے بعد رانی تخت سے برطرف کی گئی۔ اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی (جان کمپنی) کی پناہ میں بھاگ آئی۔ کچھ دیر تو وہ کشن گنج میں رہے۔ بعد میں فریزر کے متولیان سے اس کی کوٹھی اور متعلقہ زمین خرید لی۔ جب سے یہ ہندوراؤ کا باڑہ کہلاتا ہے۔ غدر گردی میں بہت شکستہ ہوگئی تھی۔ اب مرمت ہوگئی ہے۔ اب سرکاری ملکیت ہے۔ قلعہ کے سپاہیوں کے

لئے بخار کے موسم میں صحت افزا مقام کا کام دیتی ہے۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی نے انتقال کیا اور باپ کے پہلو میں خواجہ قطب الدین کی درگاہ میں دفن ہُوا۔ ابوظفر سراج الدین محمّد بہادر شاہ ثانی تخت نشین ہُوا۔ اس نے قلعۂ معلےٰ کے اندر ظفر محل اور درگاہ قطب صاحب مہرولی کے قریب ایک محل تعمیر کرایا۔ آپ شاعر بھی تھے۔ ظفر تخلص تھا۔ ایک دیوان موجود ہے۔

یہ خاندانِ مغلیہ کا آخری تاجدار ہے۔ پہلے بھی سلطنت نام کو تھی مگر بزرگوں کے نام کا سکّہ ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ تمام راجے نواب شاہ قلعۂ معلےٰ کو بادشاہ ہند مانتے تھے۔ یہاں سے خطاب حاصل کرنا باعثِ عزّت و افتخار تھا۔ سکّہ شہنشاہ کا چلتا تھا۔ نذرانے تحفے تحائف خراج پہنچتا رہتا تھا۔

دہلی دارالسلطنت تھی۔ اس کی شان تمام ہندوستان میں نرالی تھی۔ اس کی لیاقت، عظمت، ثروت، دولت، فن تعمیر، ہنرمندی میں کسی کو شبہ نہ تھا۔ سارے ہندوستان کا سیم و زر اور قابل دماغ یہاں جمع ہو چکے تھے۔ اہلِ ہنر اور صاحبِ جوہر کہاں کہاں سے کھنچے چلے آئے تھے۔ دہلی کا شہر اس وقت سلطنت کا مرکز تو تھا ہی۔ مگر ساتھ ہی فضلائے دہر اور علمائے روزگار کا بھی مسکن تھا۔ دہلی کا تخت علم دوست اور ہنر پرور تھا۔ اربابِ کمال ہر کونے سے چلے آتے تھے۔ ہر ملک کے استادانِ فن اور طالبان علم و حکمت

کا یہ مامن تھی۔ ظاہری اور باطنی دولت دھڑ یوں لٹتی تھی مسافر دولت سے مالا مال ہوجاتے تھے۔ اسی سبب سے جب فوجی طاقت کمزور ہوئی، اس شہر کے لئے مصیبت پہ مصیبت ہی رہی۔

یوں تو جب دشمنوں سے جنگ و جدل کرنے کی ہمت نہ رہی تو حصولِ تخت یا حصولِ مدعا کے لئے آپس میں لڑتے مرتے تھے کسی کو قتل کسی کو زہر کہیں خانہ جنگی غرض اس طرح تباہ و برباد ہوئے۔ حریفوں نے بیچارہ دیکھا تو ٹوٹ پڑے۔ اس خاک پر ہر روز نئی شکل میں مصیبت ظاہر ہوتی تھی مومن کے الفاظ میں دلی کا مرثیہ ملاحظہ ہو ؎

خاک اڑائی میں نے کیا طرزِ جنونِ قیس کی
شاہجہان آباد سارا نجد کا بن ہوگیا

آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے
چشم کا سوراخ کشتی کا روزن ہوگیا

داغ سینہ سے دل و جان و جگر سب پھک گئے
تھا چراغِ خانہ ہم کو برق خرمن ہوگیا

(مومن)

دہلی ایک کھلا دسترخوان تھا جس کی طرف لوٹ مار کے بھوکے، بلا روک ٹوک چلے آتے تھے۔ مگر بار بار کی غارتگری سے برباد ہوگئی تھی۔ ویرانہ نظر آتی تھی پھر بھی دہلی تھی ہر طرف سے لوگ منصوبے باندھ کر زر و جواہر حاصل کرنے کی غرض سے لشکر لیکر چلے آتے تھے۔

بوئے گل خود بچمن راہ نما شد ز نخست
ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزارے ہست

ساقیا تنگ دل از شورشِ مستاں نشوی   خود تو انصاف بدہ ایں ہماں ہنگامہ گسپت

(اقبال)

نادر گردی نے بہت گہرا اثر کیا۔ یہ ضرب بہت شدید تھی سلطنت کی طاقت بہت کم ہو گئی۔ پھر سنبھل نہ سکی۔ بعد کے حملوں نے اس میں اضافہ کیا۔ مرے ہوئے کو مارا۔ رکھا گیا تھا۔ لاوارث مردے کی بے حرمتی کی۔

بہادر شاہ کی بدنصیب ذات کے ساتھ، خاندانِ مغلیہ کا ٹمٹماتا چراغ بھی گل ہو گیا۔ وہ شمع بجھ گئی۔ اور خاندانِ تیموریہ صفحہ عالم سے رخصت ہو گیا۔

اے مصحفی کیا روؤں میں اگلی محفلوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں
مصحفی

اس کا قصہ بہت دردناک ہے۔ قلعہ والوں پر تو جو کچھ گذری سو گذری بے تعلق خلقِ خدا کا اس قدر ناحق خون ہوا۔ شریفوں کی وہ بے حرمتی ہوئی اور فاقوں کے سبب وہ گت بنی کہ اس کے تصوّر سے آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں۔ گو انگریزوں نے شاہی نام مٹانے کا تصفیہ پہلے سے یورپ کے کاغذی آئین کے مطابق کر لیا تھا مگر قادرِ مطلق کو یہ طریقہ منظور نہ تھا۔

دس مئی ۱۸۵۷ء کو آگ کا شعلہ میرٹھ سے اُٹھا۔ پوربی سواروں نے جنہیں تلنگے کہتے ہیں افسروں کو قتل کیا اور دہلی کا راستہ لیا۔ کابلی دروازے سے

جو کشتیوں کے پل کے سر پر واقع تھا۔ شہر دہلی میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ یہاں پر مدافعت سخت دیکھ کر راج گھاٹ دروازے سے شہر میں گھس آئے۔ اس لئے اس دروازے کو اب بند کر دیا گیا ہے۔ نیچے اُترنے کو صرف سیڑھیاں موجود ہیں۔ باغیوں نے شہر کی رعایا پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ جو کچھ کہیں سے نظر آیا لوٹ لیا۔ نہتے، افرنگی بچے عورتوں کو جو کوئی ملا تلاش کر کے جان سے مارا۔ بے اصول انسانوں کا ایک طوفانِ بدتمیزی تھا۔ فرعونِ بے سامان تلنگہ یہ کہتا تھا کہ جس کے سر پر ہمارا جوتا ہوگا وہی بادشاہ کہلائیگا۔ قلعہ کے بادشاہ اور شہر کے مقتدر لوگوں نے شروع میں انگریزی عورتوں بچوں کی مدد کی۔ بادشاہ پہلے آدمیوں میں سے تھا جنھوں نے بغاوت شروع ہونے کی اطلاع لفٹننٹ گورنر کو آگرے بھیجی۔

دہلی شہر اور گرد و نواح میدانِ کارزار بنا ہوا تھا۔ انگریزی فوج سے باغیوں کی کئی جھڑپیں ہوئیں۔ آٹے کے ساتھ گھن بھی پسا۔ بانیٔ شہر شاہجہان آباد اور لال قلعے میں تھے اور انگریزی فوجیں فصیلوں کے باہر بڑے معرکے ہوئے کشمیری دروازے کی فصیل گولہ باری سے توڑ دی گئی۔ آخر ۱۴ ستمبر کو بڑی مشکلوں سے دہلی فتح ہوئی۔ افواجِ انگلشیہ کے ماہرانِ فنِ جنگ کا خیال ہے کہ اگر باغیوں کا کوئی تجربہ کار جرنیل ہوتا اور وہ اسے اپنی منشا کے مطابق احکام جاری کرنے کی اجازت دیتے تو حالاتِ مابعد کی صورت بالکل مختلف

ہوتی۔ باغی بڑے دل گردے سے لڑے۔ آخری وقت تک بغیر مدافعت ہاتھ سے بندوق نہ چھوڑی۔ گلی گلی میں ان کے پیچھے پھرنا پڑا۔

خدا دشمن کو بھی روزِ بد نہ دکھائے ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے غدر کا کچھ دیکھا سنا ہے۔ اگر نام لو، ڈر کے مارے سہم جاتے ہیں اور بات منہ سے نہیں نکلتی۔ اس کا تصور سوہانِ روح ہے۔ آخری حملے میں جب فصیل توڑی گئی۔ انگریزی فوج کی چھوٹی بڑی پچاس توپیں ایک وقت میں گولے پھینک رہی تھیں بعض فصیل کے بہت قریب تھیں۔ باغیوں کی توپیں اور فریقین کے بندوقوں کے فائر اس کے علاوہ محشر خیز شور اور دھما کا کس انداز کا ہوگا یہ طوفان دو دن اور دو رات تک برابر رہا۔ غدر کے دنوں میں طرفین کی توپوں اور عسکری مجبوریوں نے شہر کے باہر رج کی طرف کی تقریباً تمام عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ بہت سے مکان گر گئے۔

فتح کے بعد مارشل لا (فوجی قانون) ہوا۔ ہر لمحہ یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی زمین پھٹی یا آسمان ٹوٹا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی۔ ہر فرد پر بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ سینکڑوں پھانسیاں شہر اور گرد و نواح میں نصب کردی گئیں۔ بلا امتیاز گلے میں رسی ڈال لٹکا دیا۔ جو بچے کالے پانی روانہ کردئیے۔ تیمور اور نادر شاہ پرانی تہذیب کے نمائندے تھے وہ فوری فیصلہ دیتے تھے اور انہوں نے قلیل عرصے میں کام تمام کردیا تھا۔ لیکن یہاں برسوں تک دار و گیر

کا سلسلہ جاری رہا۔ آتشِ انتقام یا سیاسی چالوں نے بہت سے نامۂ اعمال سیاہ کرائے۔ اسکے بعد تمام شہر کے ساکنین شہر سے نکال دیئے گئے۔ یعنے شاہجہاں آباد تمام کا تمام خالی کرا لیا۔ رہنے کو جہاں کسی کے سینگ سمائیں! ذرا سوچو تو کیا منظر ہوگا۔ خدا نہ دکھلائے! یہ بھی ارادہ تھا کہ تمام شہر کو معہ عماراتِ قدیم ہستی سے صاف کر دیا جائے لیکن خیر گذری۔

کچھ عرصے کے بعد ہندوؤں کو شہر میں آنے کی اجازت ہوئی۔ ۱۱ جنوری ۱۸۵۸ء کو مسلمانوں کو شہر میں واپس آنے کی اجازت دی گئی۔ تمام شہر سرکار کی ملکیت تھا۔ نئے سرے سے جائداد بٹی۔ حقوق اور جائداد والوں نے مطالبہ کیا۔ سرکار نے گھروں اور کوٹھیوں کو اپنی طرف سے تقسیم کیا۔

فلیگ[۱] سٹاف (جھنڈا اڑانے کا برج) جسے باوٹہ بھی کہتے ہیں غدر کی یادگار ہے جس پر اس زمانے میں انگریزی جھنڈا لہراتا تھا۔ غدر کی فتح کے بعد "یادگارِ غدر" کا مینار ۱۸۶۳ء میں بنا۔ یہ دونوں عمارتیں برج (پشت کوہ) کے اوپر کابلی دروازے کے باہر واقع ہیں۔ غدر کے باعث یہ برج بھی بہت مشہور

---

[۱] فلیگ سٹاف کے قریب ایک ۱۹۰۴ء کا نصب کیا ہوا، گریٹ ٹرگنومیٹرکل سروے کا سٹینڈرڈ بنچ مارک یعنی معیاری اونچائی کا کتبہ موجود ہے۔ اس کے گرد لوہے کا جنگلہ ہے۔ ایک چھوٹے پتھر کی چوٹی کی اونچائی اوسط سطح سمندر سے ۷۵۰،۸۵ فٹ ہے یعنی کوئی ساڑھے سات سو فٹ کے قریب۔ اس سے ہم دہلی کے علاقے کی ارتفاع کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ہے چونکہ یہاں انگریزوں کی توپیں اور لشکر کا کیمپ تھا۔

اس قیامت خیز ہنگامے کے بعد بادشاہِ ہندوستان پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ ولایت سے ماہرانِ فن اس غرض کے لئے دہلی میں وارد ہوئے۔ اس کمیشن میں تین ملکۂ انگلستان کی طرف سے اور دو کمپنی کے افسر تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمے کی سماعت قلعہ معلّے کے اندر جنوری فروری ۱۸۵۸ء میں دیوانِ خاص میں ہوئی۔ اور اکیس دن تک رہی۔ دیوانِ خاص وہی سنگِ مرمر کا بنا ہؤا نادرۂ روزگار جو شاہانِ مغلیہ کی نیم رسمی مخصوص ملاقاتوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

لال قلعہ بھی، ایک حسرت بھری دراز و مکمل داستان ہے۔ اس لال قلعے نے ہندوستان کے کئی تاجداروں کو اپنی گودی میں کھلایا۔ جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گذار کر عدم آباد کو روانہ کیا۔ شیرخواری کی حالت میں بے بس و بے زبان شہنشاہ پنگھوڑے میں لیٹے اس کی سرخ دیواروں کو ٹک ٹک دیکھا کرتے تھے۔ جوانی کی بہار میں صولت و شوکت کے دربار و جلوس ہوتے تھے دن ڈھل گیا۔ سامنے اندھیری رات نظر آئی۔ کچھ جوش کم ہؤا کچھ رعب نے الوداع کہا۔ اپنی اپنی باری میں آئے اور چلے گئے۔ اس کے ہر کونے پر کتنے جرنیل ہتھیار بند کھڑے رہتے تھے۔ اس کے ادنیٰ متصدی کی صریرِ قلم نے کتنے صوبے اور نائب بنا لئے۔ اس کے ہر ذرّے نے کتنے مہوشوں کی پابوسی

کا فخر حاصل کیا۔ غدر گردی میں قلعے کے اندر نوبت خانے کے سامنے کا میدان قتل گاہ مقرر ہوا۔ غدر کا نام نہ لو! اس کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انگریزی عہد کے دربار کے موقعوں پر اسے ناچ رنگ عیش و نشاط کا مرکز بنایا گیا۔ اس کا چپّہ چپّہ ایک مکمل داستان ہے۔ اب حلیہ بالکل مختلف ہے۔ عجوبۂ روزگار سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کا ایک ہجوم ہر روز اسے بغرضِ تفریح دیکھنے آتا ہے۔ ہاں یہ سب سچ ہے۔ مگر اس سے زیادہ سچ یہ ہے ؎

رشکِ اعدا تو مسلم ہے ولے سچ یہ ہے
جب تو اپنا نہ ہوا دوست تو کس کا ہوگا

(میر مہدی مجروح)

لال قلعہ دنیا کا اعلیٰ ترین محل اس میں دیوانِ خاص بادشاہ کی نیم رسمی ملاقات کی جگہ جس میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے شوکت و صولت کے دربار اسی میں منعقد ہوئے۔ دیوانِ خاص میں قتل و غارت کے دیوتا، کے دو پرستاروں نے اپنا زور دکھایا نادر کی مہمانی اسی میں ہوئی۔ احمد شاہ نے عرصے تک قبضہ رکھا۔ غلام قادر کا تو سر پھرا ہوا تھا۔ بادشاہ کی آنکھیں یہیں نکالی گئیں تھیں۔ ایک اس نے خود نکالی دوسری اس کے مصاحب نے۔ یہاں بیٹھ کر وہ وہ مظالم

توڑے کہ الاماں - جاٹوں مرہٹوں، رہیلوں سکھوں نے اپنی اپنی باری میں اس کی حرمت بگاڑنے میں کوتاہی نہ کی - ان کی جنگ مال و دولت کی لوٹ ہوتی تھی - چاندی کی چھت ادھیڑلی اس پہ کئی دفعہ مورچہ بندی بھی ہوئی گولے بھی برسے - دیوان خاص روئے زمین پر فردوس جس میں تخت طاؤس رکھا رہتا تھا جس کی قیمت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے - اس مسند کو زینت دینے والا بادشاہ، جس کی ایک نگاہِ عتاب راجوں اور نوابوں کو تخت سے اتار کر گداگر بنا دیتی تھی - جس کی ایک نظرِ کرم سے خاک نشین صاحب منصب وجاہ بن جاتا تھا - وہ بہادر شاہ جس کے آبا و اجداد نے اپنے دست و بازو کے زور سے تمام ہندوستان فتح کیا - جس کے بزرگوں نے ٹراونکور تک سے خراج وصول کیا - جس کے باپ دادا کا طوقِ غلامی، اپنے گلے میں پہننا مہاراجوں کا فخر تھا آج مغربی قوانین کے بادہ نوشوں کے سامنے نظریں جھکائے - اسی دیوانِ خاص میں ملزم بنے کھڑے ہیں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم ایک سمندر پار کی تجارتی کمپنی کے ملازمین، جن کے پاس بچپن میں غالباً کھانے کو ٹکڑا نہیں ہوگا - بادشاہ ہندوستان پر منصف مقرر ہوئے - نیرنگیٔ زمانہ - جہاں پناہ بادشاہ سلامت مجرم قرار دیئے گئے -

بادشاہ کا سینہ جوانا مرگ عزیزوں کے داغوں سے چراغاں ہو رہا تھا

غرض کیا تمام شہر کے ماتم کا نمائش کدہ تھا - اس غم کی حالت کا اندازہ صرف ابوظفر ہی کر سکتا ہے - بادشاہ کے تین جوان بیٹے غدر کی نذر ہو چکے تھے - ہاڈسن نے انہیں ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار کیا - شاہجہان آباد لاتے ہوئے دہلی دروازے کے باہر پستول سے مار دیا - اسی سال اکتوبر میں بادشاہ کے دو اور بیٹوں کو مجرم قرار دیکر جمنا کے ریتے میں بار ڈالی گئی - اس آفت کے بعد بادشاہ سلامت، اس کے ہمراہ نواب زینت محل اور ان کے بیٹے مرزا جوان بخت زنگون کو جلا وطن کیے گئے -

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے
غالب

الزام یہ تھا کہ انھوں نے باغیوں کے ساتھ اس ہنگامے میں حصہ لیا ہے اور چند انگریزی جانوں کو، جو کہ شاہجہاں آباد کی شہر پناہ کے اندر، غدر سے پہلے موجود تھیں مفسدوں کے ہاتھوں تلف ہونے سے نہیں بچایا - اسّی برس کے بڈھے ایسے بادشاہ کی اس طوفانِ بدتمیزی میں کون سنتا تھا - ایک ایک تلنگہ فرعون وقت بنا ہوا تھا ؎

مجھ سے تم کیا پوچھتے ہو میرے ارمانوں کا حال
تم نہی آخر کرو گے جو تمہارے دل میں ہے

ابوظفر بہادر شاہ نے باقی تمام عمر وطن اور اہلِ وطن سے دور رہ کر

کاٹی اسی کے الفاظ ہیں ؎

غم خانۂ دنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ — اس ہمزگی میں کوئی جیتا ہے تو کیا ہیچ
کیا کیا محل و قصر بناتے ہیں تونگر — از بہر نشاں، لیک نشاں بعد فنا ہیچ
ایماں کو نہ دے ہاتھ سے غافل کہ پس مرگ — آنے کا نہیں کام ترے اسکے سوا ہیچ

(ظفرؔ)

مشیت ایزدی پوری ہوئی۔ آخر رنگون میں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ مقبرہ وہیں پر ہے۔ کسی نے تاریخ کہی۔

سراج الدین ظفر بہادر جو سوئے جنت ہوئے روانہ
کہ جنکے باعث بجھا ہُوا بھی جھلک رہا تھا چراغ دہلی
جلوس انکا "چراغ دہلی" غضب ہے قسمت نے کیا دکھایا
سروشِ غیبی سے نے سالِ رحلت کہا "بجھا ہے چراغ دہلی"

مغلیہ خاندان کا تاج و تخت دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مگر ان کے کارنامے ابھی تک زندہ ہیں۔ ان کی سلطنت کا انتہائی زمانہ ۲۴۱ سال ہے۔ انکی جونسی چیز کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں تحسین منہ سے نکلتی ہے علم پروری، علم گستری، فتح و نصرت، رعایا کا آرام و آسائش، موسیقی نقاشی فن تعمیرات، عدل و انصاف ان کے ہاتھوں سے کونسا اچھا کام نہ ہوا۔ ان کے مذاقِ سلیم اور فیض کرم سے اس ملک نے ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے۔ آفرین خود داد دینے

کو حاضر ہوتی ہے - بابر نے ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان پر شکست دی تھی - اور ہندوستان کا حکمران بنا تھا کل کی بات معلوم ہوتی ہے - آج غریب الوطن بہادر شاہ کی روح کے ساتھ ملک الموت مغلیہ خاندان کا نام بھی آسمان کو لے جاتا ہے -

عمرِ برق و شرار ہے دنیا کتنی بے اعتبار ہے دنیا
ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع عرصۂ کارزار ہے دنیا
بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیرؔ دیکھنے کو بہار ہے دنیا

(امیر مینائی)

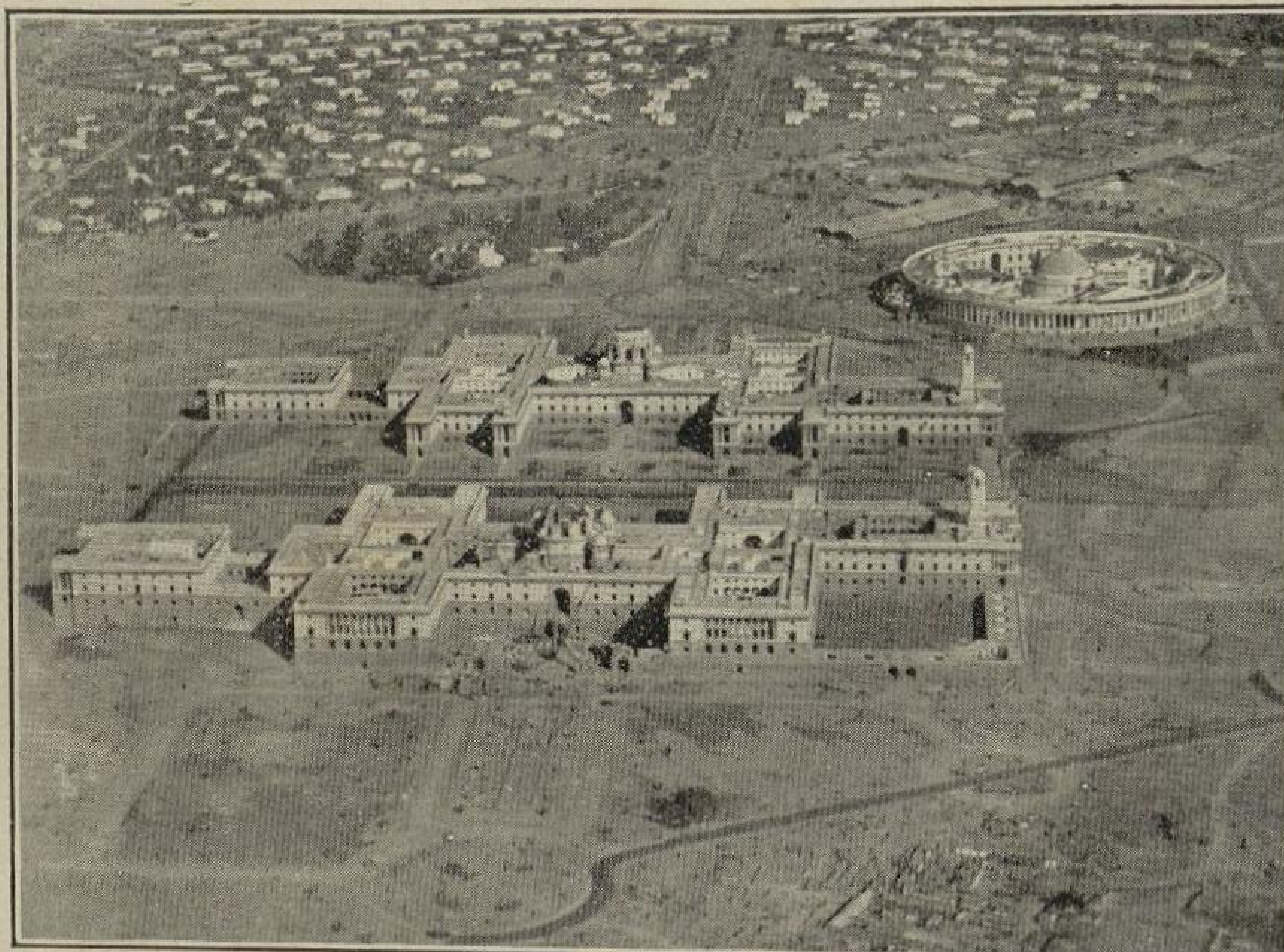
تمام مادی زندگی جامِ فنا پی کر ایک صورت سے دوسری میں تحلیل ہوتی رہتی ہے ؎

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام نہصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

(مولیناؒ رومی)

غیر فانی چیزیں جو ان کی حیات کے بعد ان کی نشانی باقی رہ جاتی ہیں - وہ ان کے قصے کہانیاں، عشق کے افسانے، علم کی کتابیں، شاعری کے صحیفے، نقاشی و صنعتکاری کے نمونے ہیں - بعد میں قوم کے عیوب و محاسن کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے - یہ زندہ جاوید نشانیاں، ان کی تعریف کے سہاگ گاتی ہیں - خواہ ایک قوم عالم کو زیر و زبر کر دے - ماہی سے ماہ تک سکہ بٹھا دے - تمام دنیا زیر نگیں ہو جب تک کہ کتابی صحیفے موجود نہ ہونگے ان کی تاریخ

مقابل صفحہ 171



امپیریل سکریٹیریٹ اور کونسل بلڈنگ

تاریکی کی گمنامی میں فراموش ہو جائے گی۔ اس میں بحث کو جگہ نہیں کہ جب حکومت معراجِ ترقی پر ہوتی ہے تو اکثر اوقات مادی عروج اور کاروباری معاملہ فہمی کو دماغی قابلیت اور ذاتی عظمت کا معیار گردانا جاتا ہے۔ اپنی حیات میں اس سلطنت کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جو خود تو کام نہ کرے مگر دوسروں کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے کی نت نئی تدبیریں سوچ سکے۔ ان میں سے اب کتنے ہمیں یاد ہیں۔ ان میں سے کتنے موجودہ نسلِ آدم کے لئے افزادِ راحت وسکونِ دل کا باعث ہیں یا کسی نئی تحریک کا سبب ہیں ہندوستان کی ساری تاریخ کسی ایسے بنئے کا نام نہیں بتا سکتی جس نے ڈھاکے کی ململ کی تجارت کا واحد مالک بن کر زرکثیر جمع کیا ہو۔ ہمیں کوئی ایسا ساہوکار یاد نہیں جس نے سود کے ذریعہ مال و دولت سے ایک نیا گنج قارون جمع کر لیا ہو۔ صرف وہ زندہ ہیں جن کے صحیفے زندہ ہیں۔

اہل فرنگستان کے لئے مغل کا لفظ ایک جادو بھری داستان ہے۔ مغل شہنشاہ قابلِ توصیف صفات کے مالک تھے۔ مغل مٹ گئے زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا مگر ان کے نام زندہ ہیں۔ خوبصورتی اور دلربائی کے کارنامے قیامت تک دلوں کو مسحور کرتے رہیں گے۔ انکے نقش ونگار آنے والی نسلوں کے لئے افزادِ علم وفضل کا سبب ہوں گے۔ انکے دماغ سے صنعت وقدرت کے بوستاں پیدا ہوتے تھے۔ وہ ہر خوبصورتی کو جو کہیں سے بھی انہیں مل جاتی

تی منجمد کر کے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے تھے۔ انکی عمارتیں ایک پر بہار چاندنی رات کا دلخوش کن خواب ہیں مغل ہماری تعریف کے محتاج نہیں ہم کسی طرح انکی تعریف ان الفاظ میں نہیں کر سکتے جسطرح کہ خاموش تصویریں ان کی تعریف میں سہرے گانے میں رطب اللسان ہیں۔ ان کی زندگی کے جس پہلو پر بھی ہم غور کرتے ہیں وہ لاثانی دکھائی دیتے ہیں مغل شاندار دل ودماغ کے مالک تھے۔ وہ عمارت کو جنات کی طرح شروع کرتے تھے اور زرگروں کی طرح ختم کرتے تھے۔ اُن کو ایک عجیب ڈھب یاد تھا کہ وہ دشت و بیابان کو ایک جلیل القدر محل ایک دلکش مسجد اور ایک پُر فزا چمن سے باغِ ارم بنا دیا کرتے تھے۔ یہ انہی کا حصّہ تھا۔ بعض قوموں کی طرح زرو مال ان کا نصب العین نہ تھا۔ ان کا مقصود بہت بلند تر تھا۔ دنیوی دولت کو وہ جاودانی راحت کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں مغل دماغ نے دُنیا میں بہت سے قابلِ قدر اضافے کئے۔ عالیشان محلات، باغ، سرائے، تصاویر، صنعتکاری اور نقاشی کے نمونے وہ علوم وفنون کے حامی، ممد اور محرک تھے۔

بعد از مرگ سرمایہ دار کا نام کسی کے ذہن میں بھی نہیں گذرتا مگر ایک قلاش مست قلندر شاعر کا نام زبانِ زد خلائق ہے۔ ایک نے اپنی تمام عمر دوسروں کی دولت چھین چھین کر، قانون کے مطابق ہی سہی، اپنے خزانے میں جمع کرنے میں جو پہلے سے بہت بھاری ہو رہا تھا۔ گذار دی یعنی ایک موجودہ شے

کی ترتیب کو بدل دیا۔ پہلے زر و جواہر کثیر التعداد انسانوں کے پاس تھے اس نے ان کو صرف جمع کر لیا - اور خود مالدار کہلایا۔ مگر دوسرے نے دنیا کے عقل و علم میں اپنی محنت اور کاوش سے، اضافہ کیا۔ اس دُلہن کو سنوارا۔ کسی کے لئے چار گھڑیاں خوشی میں گذارنے کا باعث ہُوا - دولت تو سمندر کی موج ہے ممکن ہے لعل موتی سے بھرے ہوئے بے بہا صدف کنارے پر چھوڑ جائے یا واپسی میں بہاؤ کے ساتھ جو کچھ پہلے موجود تھا وہ بھی بہالے جائے زندہ جاوید وہی ہستیاں ہیں جنہوں نے دنیا کے علوم و فنون میں اضافہ کیا۔

خاندانِ مغلیہ کے مٹنے پر دہلی کی تاریخ کا ایک دور ختم ہُوا۔ غدر کے بعد دہلی کی جو کچھ رونق تھی وہ بھی جاتی رہی، چونکہ دہلی پنجاب کے صوبے میں داخل کر دی گئی - تمام دفتر کالج وغیرہ لاہور میں منتقل کر دیئے گئے جو اس صوبے کا دارالخلافہ ہے۔ خاکِ دہلی ویسے کی ویسے رہ گئی جیسے ابتدا سے شروع ہوئی تھی - یہ ایک دور کا آخری انجام تھا، نئے سرے سے ابھرنے سے پہلے انحطاط کی عمیق تریں گہرائیوں تک پہنچنا ضروری تھا۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی، جو غدر کے ایام میں اور اس سے پہلے ہندوستان پر حکومت کرتی تھی - توڑ دی گئی - انہوں نے کچھ عرصے سے تجارت کے ساتھ حکومت کی دوکان بھی کھول لی تھی - اس کو بھی معقول منافع اور فروغ کی سبیل بنا لیا تھا۔ آخر کار معاملات اس امر کے مقتضی ہوئے کہ اس کھیل کو ختم

کر دیا جائے اور یہ ہر شروع ہونے والے کام کی مانند انجام کو پہنچکر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ہندوستان کی زمامِ سلطنت اب شاہانِ انگلستان نے اپنے ہاتھ میں لی۔ تمام ملکِ ہند بادشاہِ انگلستان کی مملکت میں شامل ہو گیا ؛

۱۱۔ عہدِ انگریزی کی دہلی

سلطنتِ مغلیہ رخصت ہوگئی۔ دہلی کے ہاتھ سے دارالسلطنت کا پروانہ بھی جاتا رہا۔ انگریزوں کا دارالخلافہ کلکتہ تھا۔ عارضی طور پر گرمیوں میں دفتر شملے آجاتے تھے۔ لیکن دہلی کی عظمت قائم تھی۔ جتنے جلوس اور اعلانِ شاہی ہوتے رہے تمام دہلی میں ہوئے اور حق یہ ہے کہ گذشتہ زمانے میں بھی پہلے تاجپوشی کہیں ہو جائے جب تک دہلی میں تاجپوشی نہ ہولے، صاحبِ تاج ہندوستان کا بادشاہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں ایڈورڈ ہفتم بحیثیت پرنس آف ویلز دہلی تشریف لائے ملکۂ معظمہ وکٹوریہ کے "اعلانِ شاہی" کا جلسہ ۱۸۷۷ء میں یہیں ہوا۔ ملک معظم شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے پیامِ شاہی کی منادی اور دوبارہ وائسرائے کے ذریعہ نیابتی تاجپوشی بھی جنوری ۱۹۰۳ء میں یہیں ہوئی جس میں شاہ انگلستان کے قیصرِ ہند ہونے کا اعلان کیا گیا۔ یہ دربار شہر سے بہت دور نجف گڈھ کی جھیل سے پرے "کارونیشن دربار پارک" میں ہوا تھا۔ اب بھی وہاں سبزہ زار قائم رکھا گیا ہے۔ حضور شہنشاہِ جارج پنجم کی ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو تاجپوشی یہیں ہوئی، اسے دہلی دربار کہتے ہیں۔

دہلی دربار کے موقع پر دارالخلافے کو کلکتے سے دہلی تبدیل کرنے کا

اعلان ہوتا۔ دہلی میں نئی دہلی کا سنگِ بنیاد حضور پُر نور ملک معظم شہنشاہِ ہند نے خود ۱۵ دسمبر ۱۹۱۱ء کو رکھا۔ گویا دہلی کی گمشدہ عظمت پھر اس کو ملگئی اور اس امر کی ابتدا قیصرِ بحر و بر کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے کتنی جلیل القدر ہستی کے لئے یہ کام رہن کر دیا تھا۔ اس عظیم الشان مملکت کا تاجدار جہاں سورج غروب نہیں ہوتا۔ انگریزوں نے بھی اس شہر کو دارالسلطنت بنانا ضروری سمجھا۔ اس خطّے میں ایک نیا شہر بسایا۔ یہ آٹھواں مقام ہے جہاں ہندوستان کا مستقبل اور قیامی دارالسلطنت آباد کیا گیا ہے۔ جو اب "نئی دہلی" یا رائے سینا کہلاتا ہے۔ اس معاملے پر بڑی مدت سے گفت و شنید انگلستان کے دربار اعلےٰ سے ہو رہی تھی مگر تاخیر ہوتی گئی، قدرت نے تبدیلِ دارالحکومت کی رسم کو اس اہم موقع کے لئے اٹھا رکھا تھا۔

ایشیائی تہذیب کے نمائندوں نے مختلف اوقات میں دہلی کو سنوارا۔ اب یورپ کی باری آئی۔ جہاں کہیں دنیا میں کسی متمدن سلطنت نے زور پکڑا اس کی نظر ہندوستان پر رہی بسکندر یونان سے۔ نادر شاہ ایران سے۔ تیمور سمرقند سے۔ محمود غزنی سے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ نپولین کا ہندوستان پر حملہ کرنے کا پختہ ارادہ تھا۔ زارِ روس کا تو اس پر ہمیشہ سے دانت تھا۔ پرتگیزوں۔ ولندیزوں فرانسیسیوں نے بھی ہندوستان

میں غلبہ حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن یہ فخر انگریزوں کی قسمت میں تھا۔

ہندوستان کا دائمی دارالسلطنت، خطۂ ہند کا فخر دہلی، ہر مذہب اور مِلت نے اُسے سنوارنے کی کوشش کی۔ ہندو، بدھ، مسلمان، عیسائی اب مغرب کا دور آیا۔ حامیانِ تثلیث بھی گرفتارِ زلفِ گرہ گیر ہوئے۔ قسمت کے لکھے سے مجبور ہیں۔ نہیں تو سات سمندر پار سے آکر اسی کو منتخب کرنا کیا ضرور تھا۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
غالبؔ

مگر یہ شرف تو دہلی کی قسمت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس خاک نے یورپ کے باسی کا دل بھی ایسا لبھایا کہ وہ اس کی زیب و زینت میں چار چاند لگانے اور اسے آراستہ پیراستہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ اس کا حق ہے۔

ہندوستان کی عہدِ انگلشیہ کی تاریخ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی جہاں اتنا صرفِ زرِ کثیر کیا گیا ہو۔ جہاں اس قدر محنت اور کوشش سے عالیشان عمارات بنانے کا خیال پیدا ہوا ہو۔ مکمل ہونے پر تمام نئے دارالسلطنت کی تعمیرات کی لاگت کا اندازہ بارہ کروڑ بانوے لاکھ روپیہ کیا جاتا ہے سکریٹریٹ بلڈنگ کے دونوں حصوں کی لاگت تقریباً ایک کروڑ چوبیس

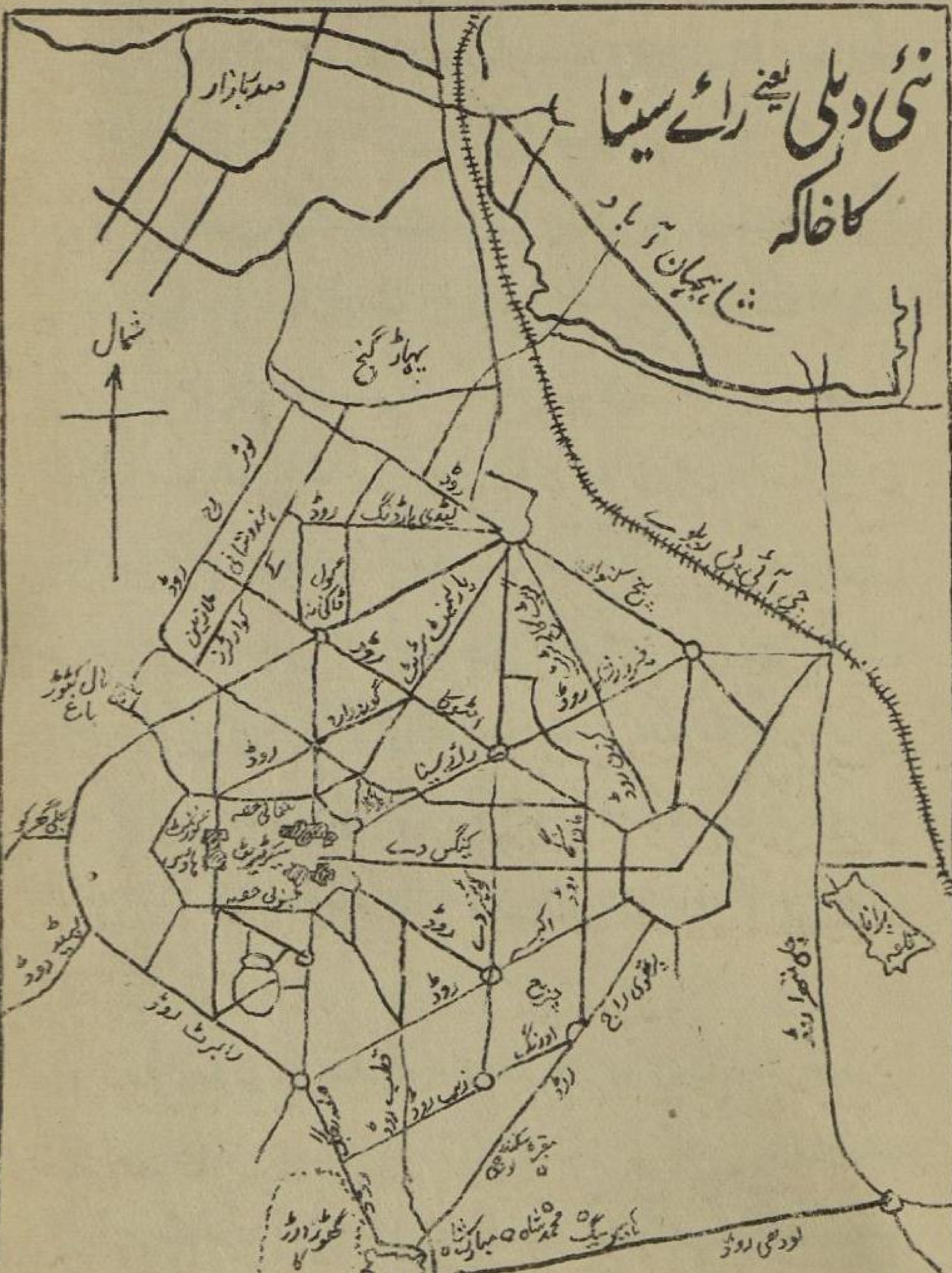
لاکھ روپیہ اور گورنمنٹ ہوس کی لاگت ایک کروڑ چالیس لاکھ کے قریب ہو گی۔ اتنی عمارات کے بنانے کے لئے مزدوروں اور کاریگروں کے لئے شہر بسے ہوئے ہیں۔ پتھر کی تراش کے لئے ایک الگ بہت بڑا کارخانہ ہے جس میں دخانی مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ چھوٹی پٹڑی کی ایک ریل تمام علاقے میں مال ڈھونے کے لئے بچھادی گئی ہے۔ کئی ممالک کے آدمی یہاں کام کرتے ہیں۔ پتھر راجپوتانے کی مشہور کانوں سے آتا ہے۔

جدید دہلی کی ٹھوس عمارت رائے سینا میں بنائی گئی ہے۔ اس قطعہ زمین میں چند خوبیاں بتائی جاتی ہیں۔ دریا کے طوفان سے محفوظ ہے قدرتی ڈھلوان ہے جس سے پانی بہت جلد بہ جایا کریگا۔ گرد و نواح میں آبادی بہت زیادہ نہیں۔ اس علاقے میں خطۂ دہلی کے دوسرے حصوں کی نسبت مقبرے اور مزار کم ہیں۔ موجودہ شہر دہلی شاہجہاں آباد کے قریب واقع ہے۔ نئی دہلی کا شہر نقشے کی رو سے صرف ستر ہزار انسانوں کی رہائش کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کی موجودہ آبادی چالیس ہزار ہے۔ اس کے مقابلے میں شاہجہان آباد شہر کی میونسپل احاطے کی آبادی ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۲۹۱۴۴ نفوس تھی۔ نئی دہلی میں ریاستوں کے حکمران بھی اپنے لئے کوٹھیاں بنا رہے ہیں تاکہ

جب کبھی دہلی آئیں تو ان میں قیام کریں۔ زمین کے چالیس قطعے مختلف والیانِ ریاست میں تقسیم کئے جا چکے ہیں۔

نیا شہر جنتر منتر اور صفدر جنگ کے درمیان پہاڑ کی کمر کے اس طرف واقع ہے۔ وسط میں پتھر کی بہت بڑی عمارت ہے۔ جو دو ہمشکل حصوں پر منقسم ہے۔ اور ان کے بیچ میں سے رستہ جاتا ہے اس کو "نیا سکریٹریٹ" یا "امپیریل سکریٹریٹ" کہتے ہیں طرزِ تعمیر کی شاعری کے لحاظ سے نیا سکریٹریٹ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانے سے ایک بڑی پتھر کی چٹان میدان میں لاکر رکھ دی ہو اور اس پر سیاہی سفیدی سے چند نشان بنا دیئے ہوں اس کی فضا میں وہ روحانی مسحور کن جادو کی تاثیر نہیں اس کے قریب ہی دائرے میں بنی ہوئی کونسل بلڈنگ ہے اس کے تمام گرد گول عمود لگاکر برآمدہ بنایا گیا ہے۔ کونسل بلڈنگ کا افتتاح سرکاری طور پر ۱۸ فروری ۱۹۲۷ء کو ہوا، دوسرے ہی دن انڈیا لیجسلیچر کا اجلاس اس میں شروع ہو گیا۔

سکریٹریٹ کی عمارت کے گرد بہت دور دراز تک کوٹھیاں مکان دوکانیں بنائی گئی ہیں اس عمارت کو ۱۹۱۱ء میں شروع کیا گیا ابتک زیر تعمیر ہے۔ گو بشیتر حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ جنگ عظیم کے تنگ و تاریک



A. Hamid Artist

زمانے (سن ۱۹۱۴ء) میں بھی تعمیر کا کام جاری رہا۔ یہاں پر سردی کے موسم میں لاٹ صاحب کے دفتر آجاتے ہیں۔ گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ چند مقامی مستقل دفتر بھی ہیں جو تمام سال یہیں رہتے ہیں۔ اب تجویز ہے کہ سرکارِ ہند کے دفتروں کا بھی ایک حصہ ہمیشہ یہیں رہا کرے۔

جب تک یہ عمارت نہ بنی تھی ایک عارضی عمارت، دفتروں کے قیام کے لئے بنائی گئی، جو کشمیری دروازے کے باہر فاصلے پر، مٹکاف ہوس کے قریب واقع ہے۔ اس کو اب "پرانا سکریٹریٹ" کہتے ہیں۔ اس رعایت سے رائے سینا کی عمارت کو "نیا سکریٹریٹ" کہتے ہیں گو اس کا نام "امپیریل سکریٹریٹ" ہے پرانا سکریٹریٹ گو عارضی استعمال کے لئے بنایا گیا۔ مگر بڑی شان کی طویل وبسیط ایک منزل کی عمارت ہے۔ اس سے اور پرے عالم شاہ کے مقبرے کی سڑک پر بہت سے کوارٹر (رہائشی مکان) ملازمینِ دفتر کی سکونت کے لئے بنائے گئے ہیں یعنی ایک نیا شہر بسا دیا۔ یہ تیمار پور کہلاتا ہے۔

امپیریل سکریٹریٹ کے گرد تال کٹورہ، رائے سینا میں بیشمار کوٹھیاں اور مکان بنے ہیں۔ دورِ جدید کی "نئی دہلی"، کی عمارت دالانوں اور دریچوں کی بھول بھلیاں ہے۔ اس کے گرد کا نیا شہر

سڑکوں کی بھول بھلیاں ہے۔ تمام ایک ہی طرح کی معلوم ہوتی ہیں تفریح کے سامان اور باغات بھی زیر تعمیر ہیں۔ تھیٹر سینما بھی بن رہے ہیں۔ بڑی عمارت کے سامنے بڑا کھلا صحن اور باغ ہے۔ اس میں پانی کے بڑے بڑے خوش وضع قطعات بڑی بہار دیتے ہیں۔ سکریٹریٹ کے حصول کے درمیان کی کھلی سڑک سیدھی اندرپت کے قریب تک چلی گئی ہے۔ اس کی چوڑائی ۱۷۵ فٹ ہے۔ اور دونوں جانب روشیں ہیں۔ اسے کنگس وے کہتے ہیں۔ باقی سڑکیں ۷۶ فٹ سے لیکر ۱۵۰ فٹ تک چوڑی ہیں۔

گو دہلی کئی دفعہ زمین سے اٹھی اور پھر فرش خاک کے برابر ہو گئی مگر ہر دفعہ نئی کہلائی۔ ہمارے لئے یہی نئی ہے۔

بہر زمانہ باندازِ تازہ مے گویند حکایتِ غمِ فرہاد و قصۂ پرویز
(اقبال)

دہلی کی خاک میں کچھ کشش ہے۔ اس کی مٹی میں انسانوں کے دل مسخر کرنے کا سحر پنہاں ہے۔ اس کے ذرے ذرے میں دماغوں کے لئے کشش جاذبیت ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس کے ہر ذرے میں سینکڑوں جرنیلوں کا خون ملا ہوا ہے۔

کیں چرخ ز صورت بتاں مہ رو صد بارہ پیالہ کرد و صد بار سبو
خیام

جن نبرد آزماؤں کی آواز سے زمین کے جگر میں شگاف پڑتا تھا آج ان کی ہڈیوں سے کمہار اپنے برتن بناتے ہیں۔ جہاں ان کا مسکن تھا وہاں اب گدھے چرتے ہیں۔ جہاں فلک بوس قیصر تھے جن کے کنگرے ثریا سے اوپر نکل جاتے تھے آج وہاں گیدڑ اپنی دلخراش آواز میں نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ کتنے جلیل القدر شہنشاہوں کی ہڈیاں پس کر اینٹ چونے میں مل چکی ہیں۔ کتنے راجاؤں کی خاکستر کی آمیزش سے گارا بنا ہوگا۔ جیتے جی کیا کیا نہ تھے۔ سر فرعون۔ دماغ شداد۔ دل نمرود۔ مگر اب خموش لیٹنا تو درکنار، زمانے نے ان کی خاک کا ذرہ ذرہ بادِ تند کے جھونکوں سے اطراف و جوانب میں پریشان کر دیا ہے۔ حقیقت کا افسانہ بننا تو درکنار، افسانہ بھی باقی نہیں۔

دہلی کے چاروں طرف کوسوں تک کھنڈرات اور قبرستان نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹے سے خطے میں گویا سارے جہاں کے مردے دفن کر دیئے ہیں۔

سنو ٹوٹی ہوئی قبروں سے پچھلی داستانوں کو!
جہاں خاموشیاں کرتی ہیں۔ باتیں یہ وہ محفل ہے
(عزیز لکھنوی)

دہلی کی چپہ چپہ زمین گویا عظمت و شان کے کثیر التعداد حکمرانوں

کی آخری نشانی ہے۔ ہر قدم پر شاہ و گدا کی صدا نکلتی ہے۔ کیا معلوم سامنے پڑا ہوا کاسۂ سر کسی جہانگیر جرنیل کا ہے۔ یا مستجیب دل آرام کا۔ مگر فنا کے راگ نے اپنی مستی میں دونوں کو دنیا کے تمام دھندوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اب وہ ہیں۔ اور ہمیشہ کے لئے خامشی۔ رائے سینا کہاں بسا، تمام قبرستان تھا۔ اب بھی ٹوٹی پھوٹی باقیماندہ قبروں کے نشان تمام احاطے میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاہجہاں آباد کے دہلی دروازے سے لیکر نظام الدین صاحب تک چلے جاؤ۔ دونوں طرف قبرستان نظر آتا ہے۔ اس کے پرے بھی گو ویرانہ ہے۔ مگر قبروں کے نشان موجود ہیں۔

ہر رہائشی مکان قہوہ خانہ ہے۔ لال قلعے نے کتنے جلیل القدر تاجدار اپنی اپنی باری میں جوانی کی بہار میں اُبھرتے اور پیری کی شام میں ڈھلتے دیکھے۔ پرانا قلعہ تو بجائے خود ایک داستان ہے۔ ہماری زندگی ایک موقتی ہنگامہ ہے۔ کئی افراد کے لئے یکے بعد دیگرے ایک شب ایک ہفتہ یا ایک عمر گذارنے کے لئے ایک مسکن کافی ہے۔ باری باری سے آتے اور چلے جاتے ہیں مگر مستقل رہائش کے لئے ایک دائمی مسکن کی ضرورت ہے۔ گوشۂ قبر، خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو میٹھی نیند سونے والے کا اپنا ہو جاتا ہے۔ بادِ مخالف مٹانے پہ آجائے

تو دوسری بات ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دہلی کے چاروں طرف قبرستان موجود ہوں۔ گو ہر صدی کے بعد ایک احاطہ صاف کر کے وہاں نئی آبادی تیار کر لی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے یہاں پر تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں قدم رکھا اور تب سے یہ سلسلہ جاری ہے۔

دنیا خواب است کشش عدم تعبیر است   صید اجل است گر جوان و پیر است
ہم روئے زمین پُر است وہم زیر زمین   این صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر است

عمر خیام

جہاں پناہ اور سیری کو ۵۰۰ سال کے عرصے تک بطور پتھر کی کان کے استعمال کیا گیا۔ یہاں کی عمارتوں کے پتھر نوچ نوچ کر دوسری جگہ استعمال کئے گئے۔ اب وہاں کیا ہے۔ ویرانی اور کوڑے کے ڈھیر۔ اب شیر شاہی شہر کو جو شاہجہان آباد اور پرانے قلعے کی سڑک کے دائیں طرف واقع ہے، اسی کام میں لایا جا رہا ہے۔ گو اب بھی اس کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا ہے۔ لیکن جو کچھ ہے تھوڑے عرصے میں صاف ہو کر نشان بھی نہیں رہے گا۔ نئی سڑکوں کے لئے روڑی حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ قریب کی پُرانی عمارتوں کے پتھروں کو کوٹ لیا جائے۔ کیا مستحسن خیال ہے۔

دورِ جدید کی آمد میں جس منظم ترتیب اور غیر متزلزل روش سے

بنانے بگاڑنے کا کام عمل میں آرہا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چند سالوں میں حلیہ بالکل بدل جائے گا۔ یہ نئے دور کا آغاز ہے۔ اس دارِ فانی کا قانون ہے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ رعب و احتشام قریب المرگ بادشاہ کو بھی الوداع کہکر چل دیتا ہے۔ ابن الوقت، دربار کے عمائد، جن کو زمانہ رمز شناس کہتا ہے مستقبل کی امیدوں کی بنا پر مفروضہ جانشین کے پاؤں چومتے ہیں۔ یہاں تو بیکس و بے لبس پتھر کے ٹکڑے ہیں کسی پرانی ثروت و شوکت کی نشانی۔ جب وہ اہلِ جاہ نہ رہے ان کے سر پہ ہل چلے کون روک سکتا ہے۔ تو ان کی بنا کردہ عمارات کے انہدام میں کون سدّ راہ بن سکتا ہے۔ نئے دور کی نمائش کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ پرانی نشانیوں کو حتی الوسع قعرِ گمنامی سے ڈھانک دیا جائے گذشتہ زمانے میں بھی جو پرانی عمارتیں کسی نئے شہر سے بعید تھیں وہ تو دستبرد سے قدرے مامون ہیں اور اب تک قائم ہیں۔ نہیں تو پرانی عمارتوں سے پتھر نکالے اپنی مرضی کا ایک مکان تعمیر کر لیا۔ مسجدیں اور مقبرے احترام کے سبب کچھ اس غارتگری سے محفوظ رہے۔ محلات جہاں کہیں بھی قدیم بادشاہوں نے بنائے تھے۔ اب تمام غائب نظر آتے ہیں۔ خدا کی شان۔ کوئی بناتا ہے۔ کوئی اکھاڑتا ہے۔

کبھی قلعے کے پاس کی سڑک سے دلی دروازے کو جاتے ہوئے ایڈورڈ پارک کے قریب بائیں کو نگاہ اٹھا کر دیکھنا۔ ایک سنگِ باسی کی چھوٹی سی مسجد ملے گی۔ اس کی برجیاں سنہری ہیں اس لئے سنہری مسجد کہلاتی ہے۔ پہلے گنبد بھی سنہری تھے اور اندر بھی سونے کے پترے لگے ہوئے تھے۔ اس کو احمد شاہ کے عہد میں جاوید خواجہ سرا نے ۱۷۵۱ء میں بنوایا تھا۔ اس وقت بالکل ویرانے کے بیچ میں کھڑی معلوم دیتی ہے۔ اور بے رونق سی پڑی ہے۔ صناعی قابل دید ہے۔ تم کہو گے کہ بنانے والا بڑا عقلمند تھا؟ اس کے سامنے دومنٹ کے راستے پر ہندوستان کی مسجدوں کا سرتاج، دہلی کی جامع مسجد موجود ہے۔ بائیں طرف قریب ہی فیض بازار میں کئی مسجدیں ہیں۔ یہاں آبادی کا نام نہیں، مسجد بنانے سے کیا حاصل۔ آخر ایک چیز استعمال کیلئے بنائی جاتی ہے۔

زمانہ بڑے رنگ دکھاتا ہے! اس علاقے میں کبھی مکان پر مکان چڑھا ہوا تھا۔ آبادی کے سبب تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور یہ مسجد، قلعہ کی ملحقہ روسا کی آبادی کے عین وسط میں واقع تھی غدر کے بعد یہ مصلحتِ عسکری سمجھی گئی۔ کہ قلعے کے اردگرد کے تمام امیروں کے محل گرا کر فرشِ خاک سے ملا دیئے جائیں۔ نہ مکان

رہے نہ اُن میں رہنے والے، دونوں آتش غدر کی نظر ہوئے اس لئے اب ہم یہاں پر بہت بڑا میدان دیکھتے ہیں، جہاں گھاس اُگ رہی ہے۔ خدا کی قدرت کوئی اینٹ اٹھاتا ہے کوئی تودہ تودہ گراتا ہے۔ لال قلعے کے اندر کے بھی کئی محل اسی مصلحت کی نذر ہوئے۔ اب ان کا نشان تک باقی نہیں دستِ انتقام نے دنیا کی صنعت کاری کا بے عدیل نمونہ صفحۂ ہستی سے نقشِ باطل کی طرح مٹا دیا

دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

بادشاہ خضر خاں (عرصۂ سلطنت ۱۴۱۴ء سے ۱۴۲۱ء) کا مقبرہ شاہجہان آباد سے آٹھ میل جنوب کی طرف اوکھلے کے قریب واقع تھا۔ آگرے کی نہر دریائے جمنا سے اوکھلے کے قریب نکالی گئی۔ اس نہر کا بننا مقبرے کے لئے وبالِ جان ثابت ہوا۔ کہیں یہ اس کی لپیٹ میں آگیا گرا کر صاف کر دیا۔ نہر کو ذرا زیادہ خم دینا یا فاصلے سے گذارنا گناہ کبیرہ ہے مقبرہ رہے نہ رہے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے — حالی

کشمیری اور کابلی دروازے کے باہر رج کی طرف کی عمارات

کو غدر گردی میں بڑا نقصان پہنچا۔ توپوں کی زد میں آکر تمام شکستہ ہوگئیں فیروز شاہی چو برجی مسجد کا ایک گنبد شہید ہوا۔ پیر غیب کی فصیلیں گر گئیں جو سڑک فیض بازار (دریا گنج) کو جاتی ہے ۱۸۵۷ء سے پہلے اس کے مغرب کی جانب اکبر آبادی مسجد تھی۔ جو شاہجہان کی ایک محل نے بنوائی تھی۔ توپوں کی زد صاف کرنے کے لئے اس کو صفحۂ عالم سے صاف کر دیا۔

رائے سینا میں جاؤ۔ تمام علاقے میں خال خال شکستہ گنبد اور قبریں کس مپرسی کی حالت میں نظر پڑیں گی۔ بے شمار سڑکیں اور راستے بنائے گئے ہیں مسمار ہونے سے صرف وہ بچ گئے جو عمارتی نقطۂ خیال سے کچھ وقعت رکھتے تھے یا سڑک سے فاصلے پر واقع ہوئے تھے۔ باقی خدا بہتر جانتا ہے ؎

بس اے میرؔ آنکھوں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا! میرؔ

یہ تو سب کچھ ہمارے سامنے ہوا۔ بھید رب جلیل کو ہی معلوم ہے کہ اس خاک پران صدیوں میں کیا کیا مصائب ٹوٹے ہونگے۔

دنیا کا چکر جاری رہتا ہے۔ بستیاں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ ایک عالیشان محل کھڑا کیا جاتا ہے۔ زمانے کا امتداد اس کو ملبہ بنا کر ایک

بنا قصر تیار کرتا ہے مگر اپنی باری میں وہ بھی قائم نہیں رہتا اس کے ساتھ بھی وہی عمل دوہرایا جاتا ہے ۔

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند اول آں تعمیر را ویراں کنند

رومی

یہ تو قانونِ قدرت ہے مگر اس کے ساتھ دہلی کی کشش ملاحظہ ہو۔ اس کے کھنڈرات میں سحر پنہاں ہے۔ اس کی خاک میں جادو کی تاثیر ہے۔ کہاں کہاں سے جلیل القدر شہنشاہوں اور عالی وقار قوموں نے اس کی زیب کو بڑھانے کی غرض سے آکر اس کے پاؤں چومے اس کو بنایا سنوارا اور یہ سمجھے کہ ہم ہمیشہ کے لئے یہاں سلطنت کرینگے وہ تمام مٹ گئیں مگر یہ زندہ ہے ۔

گوہرِ پاک تو از مدحتِ ما مستغنی است
دستِ مشاطہ چہ با حسنِ خداداد کند

وہی جمنا ہے۔ وہی خاکِ دہلی مگر وہ صورتیں کیا ہوئیں۔ وہ شاہی مجلسیں۔ شان و جلال کے دربار۔ کرّ و فرّ کی محفلیں اور ہنگامے تمام حرفِ مکرّر کی طرح مٹا دئیے گئے۔

میں نے مانا صحبتیں اگلی فسانہ ہو گئیں
اے فلک تو یہ بتا دے، وہ فسانہ کیا ہوا

ہم بھی نہیں رہیں گے مگر دہلی پہلے کی نسبت زیادہ شان سے اُبھریگی اور یہ دور اسی طرح چلتا رہے گا۔

دہلی! رہینِ انقلاب دہلی!! خدا بہتر جانتا ہے تیری بنیاد کس گھڑی میں رکھی گئی تھی۔ تو بنتی ہے اور بگڑتی ہے۔ تیری بکھری ہوئی زلفوں اور پژمردہ چہرے سے نمایاں ہے تو صدیوں کے مظالم کی متحمل ہوئی ہے لیکن ابھی ایک جنازے کا کفن میلا ہونے نہیں پاتا کہ دوسرا فدائی تیری رونق اور خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لئے میدان میں آن اترتا ہے۔

دہلی کیا سارا عالم ایک افسانہ ہے۔ ہماری ہستی نقش بر آب ہے۔ ہر پیدائش میں موت پنہاں ہے، دنیا میں کسی چیز کو دوام نہیں۔

این کہنہ رباط را کہ عالم نام است — آرام گہِ ابلقِ صبح و شام است
بزمے است کہ واماندۂ صد جمشید است — قصرے است کہ تکیہ گاہِ صد بہرام است

خیام

دنیا میں تو گزرے بھی تھے۔ قوی ہیکل، گرانڈیل، طاقتور کئی سو سال تک زندہ رہے۔ ایسے بھی تھے جنہوں نے خدائی کا دعوےٰ کیا۔ شداد و فرعون کے دماغ رکھتے تھے۔ ایسے بھی وارد ہوئے جنہوں نے اپنی ہمت اور دست و بازو سے کئی سلطنتوں کو فتح کیا۔ ملک غارت کئے مال و دولت

سیمٹی۔ وہ بھی آئے۔ جنہوں نے اپنی قابلیت اور ریاضت سے قدرت و معرفت میں موشگافیاں کیں بیش قیمت گوہر پیدا کئے۔ حکمت سے مُردوں کو زندہ کیا حُسنِ یوسف بھی تھا نفسِ مسیحا بھی، ید بیضا بھی، مگر اب تمام عالمِ جاودانی میں ہیں۔ نہ وہ زندہ ہیں جو زندہ ہوئے۔ نہ وہ جنہوں نے زندہ کیا۔ خود اس عالمگیر قانونِ قدرت پر حاوی نہ ہو سکے۔ فنا دُنیا کا اصول ہے۔ ہاں اگر کچھ زندہ ہے، تو

نہ ہر لوح نقشے بماند و لیک جز لئے عمل ماند و نام نیک

غنچہ جو ایک دفعہ چٹکتا ہے، ہمیشہ کے لئے مرجھا جاتا ہے، لیکن اس کی خوشبو کی یاد فنا کے بعد بھی دلوں کو معطر کرتی رہتی ہے۔ اس کا دلفریب منظر آنکھوں سے محو نہیں ہوتا۔

ہماری طاقتیں اور پرواز کی حد مقرر ہے۔ موجودہ عقل رسا اور قوت بازو کی امداد سے ہم ایک معین دائرے سے باہر نہیں جا سکتے جس طرح حضرتِ عیسےٰ اندھے انسان کو بینائی تو بخش سکتے تھے مگر چشمِ سوزن کو قابلیتِ نظارہ عطا کرنا ان کی بساط سے باہر تھا۔ موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے۔ یہ ہمارے دائرے سے پرے ہے۔ ان مقاصد کے حصول کی بے سُود کوشش میں، جن کو فتح کرنے میں ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، ہمیں اطمینانِ قلب کو نہیں کھونا چاہئیے۔ ہاں موقتی ماحول

سے بہترین امداد اخذ کرتے ہوئے زندگی کو بہتر بنانا فرضِ اولیّن ہے۔

دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔ اس کے مختلف مکان سرائے کی کوٹھریاں ہیں۔ عالیشان محل اور پھوس کا جھونپڑا دونوں ایک ہی کام دیتے ہیں یعنی رین بسیرے کی سبیل۔ مسافر سوئے ازل سے آتے ہیں۔ اور عدم آباد کو سدھارتے ہیں۔ یہ لامتناہی سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے۔ قانونِ ایزدی ہے۔ پیدائش اس منزل کا آغاز ہے جس کا موت انجام ہے۔ فنا زائیدگی سے مضمر ہے نہیں تو یہ سلسلہ قائم و دائم ہونے کی صورت میں کسی اور روش پر ہوتا۔ موت پر کوئی بھی فتح نہیں پا سکا۔

قدرت نے ہر مقام پر دہلی کی کہانی کا اعادہ کیا ہے۔ صرف یہ کہ دہلی وسعت اور اہمیت میں عظیم ہونے کے سبب زیادہ نمایاں ہے۔ قصہ وہی ہے۔ زمانے کی شکل بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ افسانہ رہجاتا ہے جو امتدادِ زمانہ سے فراموشی کی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے ؎

ہاں! کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
غالب

مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔

اور جیتے جی مردوں کے برابر ہوں۔ نہیں! ہر حیات کا ایک معیّن مقصد ہے اور زندگی، مرجانے سے زیادہ دشوار ہے۔ اس کے معنی دائمی عیش و آرام نہیں بلکہ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ماپ
جاوداں ہر دم رواں پیہم دواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

(اقبال)

"DIHLI"

(DELHI)

Delhi the metropolis of India is the most important historical town of this sub-continent. A history of DELHI means a summary of the history of India: and that is actually what this book is. It gives a short but precise account of the eight cities of Delhi, their history, a history of the ruling dynasties, the buildings erected and mentions the various political and social changes which took place during this period.

The book contains many maps and photographs, and gives an account of all the buildings, erected in the area around Delhi, about which history mentions. It will therefore serve as a usefull guide to those who wish to *See* Delhi.

by

Zaka-ul-Mulk, Khawja

Doctor F. M. Shuja,

Munimi,

M.A. (Alig. / *Persian*); B. Sc. Honours / *Physics & Chemistry*; M.A. (Pb. / *Arabic*)

M. Sc.; M.H.S.S. (*U. S. America*); Ph. D.; M.R.S.L. (*London*).

BAHAWALPUR

Only title printed at The Army Press, Lahore.